جلد 12، شمارہ 1

جنوری تا دسمبر، 2019

چیلنج

ایڈیٹر: عذرا طلعت سعید

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کروگے ...

کہنے کو تو ہمیں نوآبادیاتی دور سے آزاد ہوئے 72 سال ہوچکے ہیں پر ملک کے حکمرانوں کی حکمت عملیوں پر نگاہ دوڑائیں تو یہ شک گزرتا ہے کہ کیا واقعی ہمیں نوآبادیات سے نجات حاصل ہوگئی ہے؟

کئی دہائیوں سے دو سیاسی جماعتوں کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کے بعد ایک تیسری سیاسی جماعت نے انصاف اور بڑی بڑی تبدیلیاں لانے کا وعدہ کرتے ہوئے اقتدار حاصل کرلیا۔ افسوس کے اس اقتدار کے صرف دو سالوں سے کم عرسے میں ہی عوام دوست نعرے، قومی عزت و وقار کی حفاظت کے بلند بانگ دعوے پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئے ہیں۔ حکمران جماعت کے سرگرم رہنماؤں کو نظر انداز کرکے عالمی مالیاتی اداروں کے پسندیدہ افراد کی ایماء پر آئی ایم ایف سے کیے گئے سخت عوام دشمن شرائط و معاہدے کچھ ہی مہینوں میں منظر عام پر آگئے۔ جس کے نتیجہ میں پانی، بجلی، گیس اور تیل سمیت ہر شئے کی قیمتیں آسمان تک پہنچ گئی ہیں۔

پچھلی حکومتوں کی پالیسیوں پر سخت تنقید کے باوجود ان کی ہی آزاد تجارتی معاہدوں کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیا جارہا ہے۔ ایک طرف کسانوں کے لیے گندم کی امدادی قیمت نہ بڑھانے جیسے فیصلے اور کہیں ان سے گندم خریدنے سے ہی گریز۔ دوسری طرف گندم برآمد کرکے زر مبادلہ کمانے کی کاوشیں اور نتیجہ میں آٹے کا شدید بحران۔ جس سے مزدور کسان سخت پریشان حال ہیں۔

عوام آئی ایم ایف کی چکی میں تو پس ہی رہے ہیں لیکن ملک کے بڑے بڑے سرمایہ دار بھی استحصال کرنے میں پیچھے نہیں۔ مثلاً ملک میں پانی کی شدید قلت میں بھی گنے کی کاشت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ گنا غذائی فصل نہیں تو آخر اس کو فروغ کیوں دیا جارہا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ بڑے پیمانے پر گنے کی کاشت کا مقصد صرف چینی کی نہیں بلکہ نباتاتی ایندھن (ایتھنول) کی پیداوار اور اسے برآمد کرنا اولین مقصد ہے۔ گنے کی کاشت سے چھوٹے اور بے زمین کسان مزدوروں کا استحصال کرکے، ان کے خون پسینے سے بے تحاشہ دولت کا ارتکاز کیا جارہا ہے۔ یہ واضح ہے کہ پانی جیسے اہم قدرتی وسیلہ جس کی شدید قلت ہے کو عوام اور چھوٹے و بے زمین کسانوں کے روزگار کے لیے نہیں بلکہ منافع کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

عالمی تجارتی ادارہ (WTO) کی پالیسیاں ہم پر مسلسل مسلط کی جارہی ہیں اور ان پر عمل درآمد کے لیے پیور فوڈ اتھارٹیوں جیسے نئے استحصالی اداروں کا قیام عمل میں لایا جارہا ہے۔ 90 کی دہائی میں عالمگیریت کے خلاف کھڑی ہونے والی بڑی بڑی تحریکوں کے خدشات اب درست ثابت ہورہے ہیں۔ لیکن شاید عوام ابھی تک ظلم و استحصال کے اس شیطانی چکر کو سمجھ نہیں پائے ہیں اور وہ مزید گھاؤ کے انتظار میں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ انصاف اور حق کبھی ملتا نہیں، جب تک عوام ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ظلم کے آگے ڈٹ نہیں جائیں۔ ضرورت ہے کہ مذہب، ذات، زبان اور جنس میں بٹنے کے بجائے ہم اپنی پہچان ''مزدور طبقہ'' کی حیثیت سے کرواتے ہوئے سامراج، جاگیردار، سرمایہ دار اور پدر شاہی کے خلاف جدوجہد کے لیے کھڑے ہوجائیں۔

فہرست مضامین

حقیقتیں تلخ تلخ!..... 2

بجٹ 2020-2019: ایک جائزہ..... 8

پانی اور اس کی کمی کے مضمرات..... 14

خصوصی تحریر: گندم کا بحران..... 24

گنے کی پیداوار پورٹ 19-2018..... 28

''خالص دودھ'' کی سیاست..... 40

بات تو سچ ہے مگر اور رخ زمانہ.... 44، 51

چیلنج روٹس فار ایکوٹی (Roots for Equity) نے شائع کیا ہے۔

سیکرٹریٹ: اے۔1، فرسٹ فلور، بلاک 2، گلشن اقبال، کراچی

فون: 0092 21 3481 3320 فیکس: 0092 21 3481 3321

ویب: rootsforequity.org

حقیقتیں تلخ تلخ!

تحریر: عذرا طلعت سعید

جیسا کہ چیلنج کے پچھلے شماروں میں لکھا گیا روٹس فار ایکوٹی کی ایک اور اشاعت ''حال احوال'' میں چھپنے والا ''نقطہ نظر'' کو یہاں پر ایک نئے عنوان ''حقیقتیں تلخ تلخ'' کے ساتھ پیش کیا جانے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ ''حال احوال'' سال میں تین بار چھپتا ہے اور چار چار ماہ کی زرعی خبروں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ خبریں پاکستان کے تین بڑے انگریزی اخباروں سے لی جاتی ہیں جن میں شامل ہیں ڈان، دی ایکسپریس ٹریبیون اور بزنس ریکارڈر۔ اس کے علاوہ دی نیوز کے اتوار کے شمارے سے زراعت سے منسلک خبروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

چیلنج کے اس شمارے میں ''حال احوال'' میں 2019 کے تینوں شماروں میں چھپنے والے ''نقطہ نظر'' میں خبروں کی بنیاد پر پیش کردہ تبصرے کا ایک جامع خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔ جس کا مقصد ہے کہ ملک میں سال بھر میں زرعی شعبہ اور ماحولیات سے جڑے واقعات کے تسلسل کو سمجھ سکیں۔

اگر ہم پورے سال کی معاشی، سیاسی، ماحولیاتی اور سماجی زندگی پر نظر دوڑائیں تو عدم مساوات اور نیولبرل ازم پر مبنی سیاسی و معاشی پالیسی ڈھانچہ کے ذریعے سرمایہ دارانہ مشینی ترقی کو مشعل راہ بنا کر تیزی سے ہر شعبہ میں فروغ دیا گیا ہے۔ اس غیر پائیدار ترقی کے اثرات بھی بہت واضح ہیں جو سال کے شروع مہینوں میں ہی کبھی بھارت کی ریاست کیرالہ میں شدید گرمی، کبھی امریکی ریاستوں میں شدید سردی کی لہر کی شکل میں نمودار ہوئے۔ آسٹریلیا میں بھی 49 ڈگری سینٹی گریڈ تک کی گرمی کی شدید لہر سے انسان و حیوان تباہی کے دھانے پر جا کھڑے ہوئے۔

سرمایہ داری پر مبنی صنعتی ترقی اس خیال کی بنیاد پر پروان چڑھائی جارہی ہے کہ انسان مشینوں اور جدید سائنس کے ذریعے ماحولیاتی مسائل سے نبٹ لے گا۔ ایک مثال عرب ممالک کی ہے جہاں جدید ٹیکنالوجی کی بنیاد پر ''جنگل میں منگل'' جیسا سماء تو پیدا کردیا گیا لیکن یہ خبر نہایت تشویشناک ہے کہ کھارے پانی کو قابل استعمال بنانے کی صنعت (desalination plants) میٹھے پانی سے کہیں زیادہ آلودہ مواد پیدا کرتی ہے۔ ایک لیٹر میٹھے پانی کے حصول کے لیے ڈیڑھ لیٹر نمکیات سے بھرپور محلول واپس سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے جو سمندری درجہ حرارت میں اضافہ اور اس میں آکسیجن کی مقدار کو کم کردیتا ہے۔ اس آلودہ محلول کا تقریباً آدھا حصہ صرف چار ممالک سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور قطر پیدا کرتے ہیں۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ 2018 میں سمندری حرارت اپنی انتہائی بلند سطح پر پہنچ گئی ہے جس کے بعد عالمی حدت سے سمندری حیات کو لاحق خطرات کے حوالے سے نئے خدشات بڑھ رہے ہیں۔ عالمی موسمیاتی ادارے (World Metereological Organization/WMO) کے مطابق پچھلے چار سال گرم ترین ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق یہ حکومتوں، کاروبار اور شہروں کے لیے ایک اور ''واضح اشارہ'' ہے۔

سال بھر دیہی معیشت میں محنت کش کسان مزدور کئی طرح کے بحران کا سامنا کرتے رہے۔ ایک طرف بارشوں اور پھپھوندی جیسی بیماریوں سے گندم کی فصل متاثر ہوئی، پانی کی شدید کمی کی وجہ سے کئی فصلوں کی پیداوار کم ہوگئی، کپاس جیسی اہم فصل کی پیداوار میں 17.4 فیصد کمی اور دوسری طرف ملک بھر میں ٹڈی دل کا شدید حملہ دیکھا گیا جس سے فصلوں کو شدید نقصان کی اطلاعات سال کے آخری ہفتوں تک موصول ہوتی رہیں۔ بلوچستان سے لے کر پنجاب تک اس وبا نے تباہی پھیلائی ہے۔ گوکہ ٹڈی دل کے حملے سے کل نقصانات پر اعداد و شمار تو سامنے نہیں آئے لیکن اسٹیٹ بینک کی سہ ماہی رپورٹ کے مطابق 19-2018 میں اہم فصلوں چاول، گنا، کپاس اور گندم کی پیداوار میں کمی دیکھی گئی۔ پیداوار میں کمی کی وجہ زیر کاشت رقبہ میں کمی جس کی بنیادی وجہ زرعی مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں اور پانی کی شدید قلت بتائی گئی ہے۔

ڈان اخبار میں ستمبر، 2019 کی ایک خبر کے مطابق گلگت بلتستان میں درجہ حرارت میں مسلسل اضافے سے قدرتی آفات اور ان کی شدت میں اضافہ ہورہا ہے جس کی وجہ سے زرعی شعبہ کا استحکام خطرہ میں ہے جو ہزاروں مقامی افراد کا ذریعہ معاش ہے۔ کسانوں کے مطابق پچھلے پانچ سالوں میں گندم کی پیداوار میں 50 فیصد تک کمی ہوئی ہے اور اس میں اب تک کوئی بہتری نہیں آئی ہے۔

جرمن واچ کی جاری کردہ کلائمٹ رسک انڈکس (Climate Risk Index2020) کے مطابق پاکستان ان ممالک کی فہرست میں پانچویں نمبر پر

ہے جو گزشتہ دو دہائیوں کے دوران موسمی تبدیلی سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔1999 سے2018 تک پاکستان میں9,989 جانوں کا نقصان، 3.8 بلین ڈالر کا معاشی نقصان اور152 شدید موسمی واقعات رونما ہوئے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق پارلیمانی کمیٹی برائے انسانی حقوق کے ارکان یہ جان کر دنگ رہ گئے کہ پاکستان میں ہر سال موسمی تبدیلی سے بلواسطہ یا بلاواسطہ 128,000 افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ ایڈیشنل سیکریٹری وزارت موسمی تبدیلی نے کمیٹی کو یہ معلومات بھی فراہم کیں کہ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے پاکستانیوں کی اوسط عمر میں دو سے پانچ سال کی کمی ہوسکتی ہے۔ ملک میں 43 فیصد آلودگی کی وجہ کم معیار کا درآمدی ایندھن ہے جو آمدورفت اور توانائی کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے۔ پاکستان کی ایندھن (تیل) کے حوالے سے آخری پالیسی 1997 بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد سے کسی نے بھی نئی پالیسی نہیں پیش کی جو جدید ترقی، ٹیکنالوجی اور ضروریات کے مطابق ہو۔ پاکستان میں اب تک ایندھن کا معیار یورو۔2 نافذ ہے جبکہ دنیا یورو۔6 ٹیکنالوجی استعمال کررہی ہے۔

موسمی تبدیلی سے جو بگاڑ سامنے آرہا ہے اس سے نبٹنے کے لیے سرمایہ دار منافع خوری کے نت نئے ڈھنگ ڈھونڈھ رہا ہے۔ ایک خبر کے مطابق فوجی فرٹیلائزر کمپنی ملک میں غذائی تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے کام کررہی ہے جس سے اس وقت 80 ملین سے زیادہ افراد متاثر ہورہے ہیں۔ فوجی فرٹیلائزر اپنی غیر منافع بخش تنظیم ''سونا ویلفیئر فاؤنڈیشن'' کے ذریعے پاکستان بھر میں مقامی کسانوں کو مختلف پروگراموں کے ذریعے پائیدار، موسمی تبدیلی سے مطابقت رکھنے والی زراعت کے لیے مدد فراہم کررہی ہے۔ بین الاقوامی بیج کمپنی سنجنٹا نے اس حوالے سے شراکت کے لیے سونا ویلفیئر فاؤنڈیشن کے ساتھ مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ دونوں کمپنیاں اس مشترکہ پلیٹ فارم کو استعمال کرتے ہوئے کسانوں کی صلاحیت میں اضافے (کپیسٹی بلڈنگ) اور انہیں بااختیار بنانے کے لیے تعاون کریں گی۔

واضح ہے کہ ان آفات سے دنیا کے تمام طبقات متاثر نہیں ہیں۔ آکسفیم کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے صرف 26 افراد کی دولت انسانیت کے نصف حصہ پر مشتمل غریب ترین افراد کی دولت کے برابر ہے۔ مزید یہ کہ 2018 میں دنیا کے ارب پتی امیر ترین افراد کی دولت میں مجموعی طور پر یومیہ 2.5 بلین ڈالر کا اضافہ ہوا۔

اس قدر دولت کہاں سے جمع ہو پائی؟ جواب بہت آسان ہے۔ 1995 میں عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) کے قیام کے بعد سے عالمگیریت یعنی نیولبرل پالیسی سازی سرمایہ دار طبقہ نے بزور طاقت پوری دنیا پر لاگو کرنا شروع کردی تھی۔ نیولبرل پالیسی سازی نجکاری اور آزاد تجارت کو قانون سازی کے ذریعے فروغ دیتی ہے اور اس کو نافذ کرواتی ہے۔ اس طرز عمل کے شواہد 2019 کی خبروں میں کثرت سے پائے گئے ہیں۔ اگر بات بلوچستان سے شروع کریں تو واضح ہے کہ انتہائی پسماندہ صوبے کی عوام کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ ایسٹ بے ایکسپریس وے جو کہ چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کا حصہ ہے، کی تعمیر سے چھوٹے پیداواری طبقہ پر کیا اثر پڑا ہے؟ ماہی گیروں کی تنظیم گوادر فشرمین الائنس کے مطابق انہوں نے اپنا آبائی علاقہ ''ملا بند'' پاکستان کی ترقی کے لیے چھوڑ دیا تھا لیکن اب اس ایکسپریس وے کی تعمیر سے ان کی سمندر تک رسائی ختم ہورہی ہے۔ فشرمین الائنس کے مطالبات ہیں کہ ان کی سمندر تک رسائی کے لیے راستہ تعمیر کیا جائے۔ گیس، بجلی، پانی وغیرہ کی فراہمی کے علاوہ ان کے بچوں کے لیے تعلیمی وظائف فراہم کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ جب آزاد تجارت کو فوقیت دی جاتی ہے تو عوام خاص کر مزدور طبقہ سب سے زیادہ پستا ہے۔

اسی طرح اگر سندھ کی طرف نظر دوڑائیں تو شروع سال ہی میں کسان مزدور عوام پر تکالیف کا ایک پہاڑ دیکھا گیا۔ بدین کے کسان سراپا احتجاج رہے کہ انہیں تھرپارکر جیسی خشک سالی کا سامنا تھا۔ حکمران طبقہ اور اس سے جڑے ادارے جس میں سیڈا، محکمہ آبپاشی، پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے بااثر جاگیردار سیلابی نہروں اور کوٹری بیراج کی نہروں میں رکاوٹیں کھڑی کرکے بدین کے حصہ کا پانی کھلے عام چوری کررہے تھے۔

خیبر پختونخوا کے کسان بھی گنے کی قیمتوں کے خلاف مزاحمت کرتے رہے۔ کسانوں کے مطابق کے پی میں عدالتی حکم پر حکومت عمل درآمد کرنے میں ناکام نظر آئی اور کسانوں کو ملوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ کسانوں کا خیال تھا کہ ملیں کسانوں کو لوٹ رہی ہیں یہاں تک کہ سپریم کورٹ کی مقرر کردہ قیمت ادا نہیں کی جارہی تھی۔

اس طرح کے احتجاج پنجاب کے کاشتکاروں کی طرف سے بھی ہوئے جن کا زیادہ زور زرعی مداخل کی قیمتوں کو کم کروانے پر تھا۔ پنجاب بھر کے کسانوں نے لاہور کے مال روڈ پر احتجاج کیا اور پنجاب اسمبلی کے باہر آلو سے لدی ٹرالیاں خالی کرکے آلو کو احتجاجاً آگ لگادی۔ کسانوں کا کہنا تھا کہ منڈی میں آلو کی قیمت فروخت اس کی پیداواری لاگت کے مقابلے

تین گنا کم ہے۔

ایک طرف کسانوں کا معاشی دیوالیہ پن، بے روزگاری، بے زمینی و زمینی بے دخلی تھی اور دوسری طرف خوراک و زراعت کی کمپنیوں کا بے تحاشہ منافع۔ مثلاً اینگرو کارپوریشن نے جو پاکستان کی خوراک، کیمیائی مواد اور کھاد بنانے والی کمپنی ہے، نے 31 دسمبر، 2018 کو ختم ہونے والے سال میں 23.6 بلین روپے منافع کا اعلان کیا۔ کمپنی کے منافع میں پچھلے سال کے مقابلے 45.1 فیصد اضافہ ہوا۔ اینگرو فرٹیلائیزر کی فروخت بھی 17.4 بلین روپے تک جا پہنچی۔

اسی طرح شروع سال میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق فوجی فرٹیلائیزر کمپنی نے بھی 2018 میں 14.44 بلین روپے خالص منافع کا اعلان کیا جو گزشتہ سال کے مقابلے 35 فیصد زیادہ تھا۔ شاید ملک میں ان کمپنیوں کے بے تحاشہ منافع کو دیکھتے ہوئے غیر ملکی کمپنیاں بھی پاکستانی منڈی پر قبضہ جماتی نظر آ رہی ہیں۔ بین الاقوامی غذائی و زرعی کمپنی کارگل نے آئندہ تین سے پانچ سالوں میں پاکستان میں 200 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کا اعلان کیا۔ کمپنی کی حکمت عملی میں پاکستان بھر میں مختلف شعبہ جات میں اپنے کاروبار کو وسعت دینا شامل ہے۔ ان شعبہ جات میں زرعی تجارت و ترسیلی نظام، خوردنی تیل، ڈیری مصنوعات، گوشت اور جانوروں کی خوراک کے شعبے شامل ہیں۔ ایک اہم شعبہ ''فوڈ ٹریسبلٹی'' کا ہے۔ جس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ فوڈ ٹریسبلٹی کو ممکن بنانا کارگل کے اہداف میں شامل ہے۔

فوڈ ٹریسبلٹی سے مراد ''خوراک کی پیداوار سے اس کی ترسیل کے تمام مراحل کی نشاندہی'' ہے جس کے ذریعے خوراک میں آلودگی اور خوراک کی حفاظت کے عمل کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ یہ قوانین عالمی تجارتی ادارہ (ڈبلیو ٹی او) کے مختلف معاہدوں کے ذریعہ عالمی تجارت خصوصاً خوراک کی تجارت میں متعارف کرائے گئے ہیں۔ عام خیال ہے کہ ایسے اقدامات سے چھوٹے پیمانے پر پیداوار اور اس کی تجارت کرنے والے منڈی میں مقابلہ نہیں کر پاتے اور آہستہ آہستہ بڑی دیو ہیکل کمپنیاں منڈی پر قبضہ کر لیتی ہیں۔

افسوس کہ ان قوانین پر عملدرآمد اب پاکستان میں بھی واضح ہے۔ پاکستان کے ہر صوبے میں فوڈ اتھارٹیاں قائم کردی گئیں ہیں۔ خبر ہے کہ بلوچستان فوڈ اتھارٹی نے عوام کو صاف خوراک کی فراہمی کے لیے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ کے پی میں صوبائی فوڈ سیفٹی اینڈ حلال فوڈ اتھارٹی نے 20 مارچ، 2019 سے کھلے مصالحہ جات پر پابندی عائد کرنے کا اعلان کیا ہے۔ پنجاب فوڈ اتھارٹی پہلے ہی صوبے بھر میں کھلے مصالحے کی فروخت کے خلاف کارروائی کر رہی تھی۔ پنجاب میں حکام کی طرف سے وزیر اعظم عمران خان کو ایک رپورٹ پیش کی گئی کہ پنجاب کے شہری علاقوں میں فروخت ہونے والے 70 فیصد کھلے دودھ میں نقصاندہ کیمیائی اجزاء اور جراثیم پائے گئے ہیں۔ وزیر اعظم نے پی ٹی آئی کے رہنما جہانگیر ترین کو پنجاب کے حکام کے ساتھ مل کر جراثیم سے پاک دودھ کی ''پیسچرائزیشن پالیسی'' پر کام کرنے کی ہدایت دی ہے۔ خیال رہے کہ یہ وہی جہانگیر ترین ہیں جنہیں عدالت نے تاحیات نا اہل قرار دیا۔ کیا یہ شک بے بنیاد ہے کہ صاف خوراک کے لیے کاوشیں عوام کی بہتری کے لیے نہیں بلکہ عالمی تجارتی ادارے اور ملکی اور غیر ملکی سرمایہ داروں کے لیے منڈی پر قبضے کی راہ ہموار کرنے کے لیے ہیں؟ بحرحال کھلے دودھ کے خلاف مہم سازی اور اس کو بند ڈبے میں فروخت کرنے کے عمل میں فوڈ ٹریسبلیٹی کا تعلق کافی گہرا ہے۔ جب دودھ کو گائے، بھینس سے حاصل کرکے اس کو بند ڈبے تک لانے کے تمام مراحل کو ایک خاص سند شدہ لائحہ عمل کے تحت کیا جائے گا تو ''ٹریسبلیٹی'' کے تمام لوازمات پورے ہوجائیں گے اور پاکستان میں دودھ کی پیداوار بین الاقوامی معیار کے مطابق ہوجائے گی۔ اگلا مرحلہ یقیناً دودھ اور اس سے بنائی گئی دیگر اشیاء کی برآمد کا ہوگا۔ اس حوالے سے خبریں موصول ہو چکی ہیں کہ دودھ کی منڈی پر نظر رکھتے ہوئے ملکی اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو پنیر کی پیداوار میں سرمایہ کاری کے لیے راغب کیا جارہا ہے۔

سال کے آخری مہینوں کی خبروں سے یہ واضح ہے کہ نیولبرل پالیسی سازی پاکستان کے قبائلی علاقوں تک بھی پھیلائی جارہی ہے۔ ضلع باجوڑ میں قبائلی علاقوں کے لیے وزیراعظم کے قومی زرعی ہنگامی منصوبے (نیشنل ایگریکلچرل ایمرجنسی پروگرام) کے تحت چھ منصوبوں کا افتتاح کیا گیا ہے۔ جن میں زیتون کی کاشت اور زیتون سے تیل کشید کرنے، زرتلافی کے حامل گندم کے بیج، مرغی و مال مویشی کی تقسیم اور دودھ کے کاروبار کے لیے دودھ ٹھنڈا کرنے والے ٹینک شامل ہیں۔ باجوڑ کیا پورے کے پی میں جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ پیداوار میں اضافہ اور زیتون کی کاشت پر زور دیا جارہا ہے۔

مال مویشی شعبہ پر پورے سال کافی توجہ دیکھی گئی۔ سندھ میں مال مویشی نمائش منعقد کی گئی تاکہ کسان جدید زرعی مشینری اور مال مویشی شعبہ سے متعلق مشینری کا استعمال سیکھ سکیں اور بلوچستان میں مال مویشی شعبہ میں نجی سرمایہ کاروں کو راغب کرنے کے لیے مراعات کی پیشکش۔ بلوچستان کے مال مویشی شعبہ پر مختلف امدادی اداروں کی نظر ہے۔ مثلاً اقوام متحدہ کا

ادارہ برائے خوراک و زراعت اور جاپان اس شعبہ کے لیے امداد فراہم کررہے ہیں۔ اس منصوبے کا مقصد نئی ٹیکنالوجی کے ذریعہ مویشیوں کے گوشت اور پھلوں کی پیداوار کو مستحکم کرنا ہے۔ نیولبرل پالیسی سازی کی ہوا شاید عالمی بینک دے رہا ہے کیونکہ اس کے ایک چار رکنی وفد کے مطابق عالمی بینک کا مخصوص منصوبہ اسٹرینتھنگ مارکیٹس فار ایگریکلچر اینڈ رورل ٹرانسفورمیشن ان پنجاب (جس کو سمارٹ کا نام بھی دیا جارہا ہے) کا مقصد فصلوں اور مال مویشی رکھنے والے کسانوں کی پیداوار بڑھانا ہے۔ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں ہمارے ملک کے کاروباری حلقے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ مثلاً ایوان صنعت وتجارت لاہور کے صدر کا کہنا ہے کہ ''افسوس ہے کہ مال مویشی شعبے کی ترقی کے لیے یہاں کوئی جینیاتی تبدیلی کا منصوبہ موجود نہیں''۔ ان کے خیال میں ڈیری شعبہ کی پیداوار کو بہتر بنانے کے لیے مویشیوں کی نسل کو جینیاتی طور پر بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔

مزید یہ کہ محکمہ مال مویشی پنجاب نے صوبے بھر میں شتر مرغ کے گوشت کی منڈی تک ترسیل کو یقینی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پنجاب میں شتر مرغ کے 400 باڑوں کا اندراج کیا جاچکا ہے۔ جہاں 20,000 شتر مرغ پالے گئے ہیں۔ شتر مرغ کا گوشت 1,300-1,500 روپے فی کلو فروخت ہوگا۔ صوبائی وزیر مال مویشی پنجاب سردار حسنین دریشک کا کہنا ہے کہ ''حکومت عوام کو سستا اور معیاری گوشت فراہم کرنے کے لیے کام کررہی ہے''۔ شاید ہمارے حکمرانوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ جب عوام کے لیے گائے اور مرغی کا گوشت خریدنا ہی مشکل ہوتا جارہا ہے تو وہ شترمرغ کا گوشت کس طرح سے خریدیں گے؟

حکومت پاکستان کا آزاد تجارت کو فروغ دینے والا رجحان اس کے اداروں کی پالیسی سازی سے جانچا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر سیکورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان نے زرعی اجناس کی کمپیوٹرائزڈ خرید و فروخت یعنی ای ٹریڈنگ اور مخصوص گوداموں میں اجناس کو رہن رکھ کر کاروبار کرنے والی کمپنیوں (کولیٹرل مینجمنٹ کمپنیز) کے لیے کولیٹرل مینجمنٹ کمپنیز ریگولیشن 2019 جاری کردیا ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں شرح خواندگی کم ہے، ایسے جدید خرید و فروخت کا طریقہ کار یقیناً ہمارے دیہات کے کسانوں کے لیے نہیں بلکہ سرمایہ کاروں کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ مالی سال 2018-19 کے لیے اسٹیٹ بینک نے ایک ٹریلین روپے کے قرضہ جات کی فراہمی کا ہدف حاصل کرنے کے بعد اگلے مالی سال 2019-20 کے لیے 1.35 ٹریلین روپے کا ہدف مقرر کردیا ہے۔ آئی ایم ایف میں نوکری کرنے والے افسر رضا باقر جو کہ پی ٹی آئی کی حکومت میں گورنر اسٹیٹ بینک بنائے گئے ہیں کا کہنا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار زرعی شعبہ کے لیے قرض کی فراہمی ایک ٹریلین روپے سے تجاوز کرگئی ہے۔ یہ لمحہ فکریہ ہے کہ کیا قرضہ چھوٹے کسانوں کو دیوالیہ کرنے کی طرف ایک قدم ہے؟ یا پھر بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کو سرمایہ دار زراعت سے جوڑنے کا حربہ ہے؟

اگر پاکستانی برآمدات پر نظر ڈالیں تو بھی کئی طرح کی خبریں نشاندہی کررہی ہیں کہ آزاد تجارت کو بڑھ چڑھ کر فروغ دیا جارہا ہے۔ کینو اور آم تاجکستان بھیجنے کے لیے بات چیت کا سلسلہ جاری نظر آیا۔ چین کے سفیر کے مطابق پاکستان سے چیری، آلو، گندم، کینو، چاول اور آم چین کے لیے پرکشش غذائی اشیاء ہیں۔ وزیر اعظم کے مشیر برائے تجارت، ٹیکسٹائل و صنعت و پیداوار عبد الرزاق داؤد کا کہنا ہے کہ ''ہم سی پیک کے تحت مزید توانائی کی پیداوار اور شاہراہوں کے منصوبے نہیں چاہتے ہیں، ہمیں زرعی اور برآمدی اشیاء کے لیے چین کے تعاون کی ضرورت ہے''۔ ٹریڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی آف پاکستان کی طرف سے حلال منڈیوں کے حصول کے لیے حلال پارکس، حلال خصوصی برآمدی زون اور حلال معیارات اور سند جاری کرنے کے لیے ادارہ قائم کرنے کی تدبیریں پیش کی گئیں۔ چین پر انحصار کرنے کی حکمت عملی مستقل مزاجی سے سال بھر نظر آئی۔ ایکسپریس ٹریبیون 17 نومبر، 2019 کی ایک خبر کے مطابق وفاقی وزیر قومی غذائی تحفظ و تحقیق صاحبزاہ محبوب سلطان نے اعلان کیا ہے کہ حکومت ملک بھر میں زراعت کو ترقی دینے کے لیے چین کی مدد سے 13 بڑے منصوبوں کے اجراء کی تیاری کررہی ہے۔ چین کے ساتھ اشتراک اور بہتر طریقوں کا استعمال پاکستان کے زرعی وسائل کے موثر استعمال میں مددگار ہوگا۔ ایسی ہی ایک اور خبر کے مطابق چین پاکستان میں کپڑا، اس کی رنگائی اور کڑھائی کی صنعت کے علاوہ غذائی صنعت (فوڈ پروسیسنگ) میں سرمایہ کاری کرنے کا خواہشمند ہے۔ چین کی مدد سے منڈی میں پاکستانی خوراک اور کپڑے کی مسابقت میں بہتری اور اس کے پیداواری معیار میں اضافہ ہوگا۔

زرعی پالیسی سازی میں ایک عجب سی حالت نظر آتی ہے۔ پاکستان میں کئی سال سے کپاس کی پیداوار کم ہوتی جارہی ہے۔ جبکہ بطور خام مال کپاس پاکستانی ٹیکسٹائل کی صنعت کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے جس سے لاکھوں مزدور جڑے ہوئے ہیں۔ انتہائی پریشان کن خبر یہ ہے کہ ملک میں

اعلیٰ معیار کی کپاس کی عدم موجودگی میں مقامی کپڑے کی صنعت کا انحصار درآمدی خصوصاً امریکی کپاس پر بڑھتا جارہا ہے۔ صرف چھ سال کے عرصے میں امریکی لائسنس رکھنے والے کپاس، دھاگہ اور کپڑا بنانے والے بڑے کارخانوں کی تعداد چھ ۔ سات سے بڑھ کر 36 ہوگئی ہے۔ اس سال بھی 3.5 سے چار ملین گانٹھیں کپاس کی درآمد متوقع تھی۔ مقامی کپاس کی پیداوار پر اضافی ٹیکس 10 فیصد تھا اور سوتی دھاگے (یارن) پر مزید 17 فیصد جی ایس ٹی لگا دیا گیا ہے۔ پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن کے مطابق ان تمام محصولات سے فائدہ صرف کپاس برآمد کرنے والوں کو ہوگا۔

یوں لگتا ہے کہ اب کپاس پاکستان کی زرعی پالیسی میں اپنی اہمیت کھوتی جارہی ہے۔ کیونکہ وفاقی حکومت کے زرعی ہنگامی منصوبے میں بھی کپاس کو فوقیت نہیں دی گئی ہے۔ حکومت کی توجہ خوردنی تیل، گندم، چاول اور گنے کی پیداوار میں اضافے پر رہی۔ گو کہ خوردنی تیل اور گندم دونوں عوام کی خوراک اور زرمبادلہ بچانے کے لیے اہم فصلیں ہیں لیکن چاول اور گنا دونوں ہی فصلیں بہت زیادہ پانی پر انحصار کرتی ہیں اور پانی کی بڑھتی ہوئی قلت کے پیش نظر یہ فصلیں مجموعی زرعی پیداوار کے لیے مسائل کھڑے کریں گی۔ یہ خیال رہے کہ کپاس کی فصل میں بحرحال چاول اور گنے سے کم پانی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہمارے صنعت کاروں نے غیر ملکی دیوہیکل کسان لابیوں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے؟ کیا کچھ ایسا ہے کہ ہمارے صنعت کار غیر ملکی کپاس سے فوائد اٹھائیں اور ملک میں کپاس کے بجائے ان فصلوں کی پیداوار پر زور دیا جائے جو بیرون ملک برآمد کی جاسکیں؟ یقیناً عالمی منڈی میں نباتاتی ایندھن یا ایتھنول کی طلب زیادہ ہے اور پاکستان گنے سے حاصل ہونے والے مولیسیس اور ایتھنول کا بڑا برآمد کنندہ ہے اور شوگر مل لابی کے اشاروں پر گنے کی پیداوار میں اضافہ جاری ہے۔

اس سال مزید پریشانی کا باعث گندم کی فصل میں حکومتی پالیسی میں تبدیلی ہے۔ اب ترجیح ہے کہ آزاد تجارتی اصولوں کے تحت گندم کی پیداوار اور ترسیل کو منڈی پر چھوڑ دیا جائے۔ سندھ کابینہ کے اجلاس میں زیادہ تر ارکان نے گندم خریداری مہم کی مخالفت کی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی پہلو واضح کیا گیا کہ گندم کی نئی قیمت کا تعین منڈی پر چھوڑ دیا جائے۔ مزید یہ کہ گندم کی برآمد پر بھی زور دیا جارہا ہے۔ اس سال بھی پانچ ملین ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پچھلے سالوں میں گندم کی پیداوار ملک کی ضرورت سے زیادہ رہی ہے بلکہ تقریباً ہر سال ہی گندم برآمد بھی کی جارہی ہے لیکن ان حالات میں انتہا یہ ہے کہ عوام کی بنیادی خوراک روٹی کی قیمت بڑھتی جارہی ہے۔ یہ سب کچھ اس پس منظر میں ہے کہ جہاں پہلے ہی بھوک اور غربت کے اشاریہ بلند ہوتے جارہے ہیں۔ قومی غذائی سروے 19-2018 کے مطابق پاکستان کی عوام شدید غذائی کمی کا سامنا کررہی ہے اور غربت کی وجہ سے تقریباً 50 فیصد سے زائد خاندانوں کو یومیہ دو وقت کا کھانا دستیاب نہیں۔ غذائی کمی کے شکار ہونے والوں میں سب سے زیادہ تعداد سندھ اور بلوچستان کے بچوں کی ہے۔ دونوں صوبوں میں نشوونما میں کمی کے شکار (اسٹنٹیڈ) بچوں کی شرح بالترتیب 45.5 فیصد اور 46.6 فیصد ہے۔ مزید یہ کہ سندھ میں 40 فیصد بالغ لڑکیاں خون کی کمی کا شکار ہیں۔ بھوک اور کم نشوونما یقیناً معاشی ترقی سے الگ نہیں۔ ایکسپریس ٹریبیون کی 11 نومبر، 2019 کی ایک خبر کے مطابق معروف ماہر معیشت ڈاکٹر حفیظ اے پاشا نے کہا ہے کہ موجودہ حکومت کے دو سال مکمل ہونے تک معاشی بڑھوتری میں کمی اور غذائی شعبہ میں افراط زر کی بلند شرح کی وجہ سے مزید 18 ملین پاکستانی خط غربت سے نیچے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر پاشا کے مطابق ملک میں غربت کا تناسب جو جون، 2018 میں 31.3 فیصد تھا جون، 2020 تک 40 فیصد ہوجائے گا۔ یعنی جون، 2018 تک غربت میں رہنے والے 69 ملین افراد کی تعداد جون، 2020 میں 87 ملین ہوجائے گی۔ غربت میں ہونے والے اس اضافے کی شرح 26 فیصد ہوگی۔ حفیظ پاشا کا مزید کہنا ہے کہ یہ صورتحال انتہائی خطرناک ہے کیونکہ خوراک کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ اور اقتصادی بڑھوتری کی شرح آبادی میں اضافے کی شرح کے تقریباً برابر ہے۔

نومبر، 2019 میں آنے والی خبروں کے مطابق یونائیٹڈ نیشنز انٹرنیشنل چلڈرن فنڈ (UNICEF) کی حالیہ رپورٹ کے نتائج خصوصاً جنوبی ایشیاء میں بچوں کی صحت کے حوالے سے پریشان کن ہیں۔ اقوام متحدہ کے نقشے میں جنوبی ایشیاء کی سرخ رنگ سے نشاندہی کی گئی ہے۔ ادارے نے خبردار کیا ہے کہ تقریباً بچوں کی آدھی تعداد کو مناسب خوراک نہیں مل رہی ہے۔ ''دی اسٹیٹ آف دی ورلڈز چلڈرن'' نامی رپورٹ کے مطابق پچھلے سال پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر کے تقریباً 409,000 بچے جانحق ہوئے جبکہ پڑوسی ملک بھارت میں 882,000 اور افغانستان میں 74,000 بچے اسی عرصے کے دوران ہلاک ہوئے۔

ان حالات میں مزید ستم یہ ہے کہ دادو، سندھ میں محکمہ خوراک

سندھ کے 11 ملازمین اور دو تاجروں پر 431 ملین روپے مالیت کی 194,000 گندم کی بوریاں غبن کرنے کا الزام لگایا گیا ہے جن کے خلاف محکمہ انسداد بدعنوانی نے مقدمہ درج کردیا ہے۔

قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ ملک میں بڑے پیمانے پر بھوک اور غذائی کمی کا حل نوآبادیاتی سوچ کے حامل امیر صنعتی ممالک اپنی منافع خوری کے لیے فراہم کررہے ہیں۔ صنعتی کیمیائی زراعت سے زمینوں کی زرخیزی اور توانائی برباد ہونے کی وجہ سے ناقص غذا کی پیداوار آج عوام میں غذائی کمی کی وجہ ہے۔ اس مسئلہ کا حل سرمایہ دار کمپنیوں اور ان کے سامراج دوست اداروں نے تیار غذائی اشیاء میں مصنوعی غذائیت کی ملاوٹ کی صورت میں دیا ہے۔ نیشنل فورٹیفیکیشن الائنس پاکستان نے عالمی غذائی پروگرام اور آسٹریلیا کی حکومت کے تعاون سے غذائی کمی سے نمٹنے کے لیے آٹے میں مصنوعی غذائیت شامل کرنے (فورٹیفیکیشن) کے منصوبے کا آغاز کیا ہے۔ اسی طرز کا ایک اور مصنوعی غذائیت شامل کرنے کا منصوبہ برطانوی امدادی ادارے کے تعاون سے جاری ہے جس کے تحت 70 فیصد آبادی کو مصنوعی اضافی غذائیت کا حامل خوردنی تیل فراہم کیا جائے گا اور 50 ملین سے زائد افراد کو مصنوعی غذائیت کے حامل آٹے تک رسائی فراہم کی جائے گی۔ لگتا ہے کہ ان امدادی اداروں کے ارادے کافی سنگین ہیں کیونکہ عالمی غذائی پروگرام کے نمائندہ کا بیان ہے کہ ملک میں بڑی آٹا ملوں میں مصنوعی غذائیت شامل کرنے کا عمل شروع ہوچکا ہے لیکن خرد غذائیت کی کمی کو دور کرنے کا ہدف اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک (چھوٹی) آٹا چکیوں کی پیداوار میں بھی مصنوعی غذائیت شامل نہ کی جائے۔ اب شاید اسی بنیاد پر چھوٹی آٹا چکیاں بند کروا کر ایک اور عوامی روزگار پر ڈاکہ ڈالنے کی منصوبہ بندی ہورہی ہے۔ خیال رہے کہ بڑی ملیں پیداوار میں مصنوعی اضافی غذائیت شامل کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی غیر ملکی کمپنیوں سے خریدتی ہیں۔ یعنی مصنوعی غذائی اجزا کی ملاوٹ منافع خور کمپنیوں کے لیے ایک منافع بخش منڈی ہے۔ ناصرف مشینیں بلکہ مصنوعی غذائی اجزاء بھی ان کمپنیوں کے لیے ایک بہت مہنگی منافع بخش منڈی ہے۔

پاکستان میں کم غذا کے شکار بچوں کے لیے امریکی فلاحی ادارے بھی اپنا کردار ادا کرنے میں حصہ لے رہے ہیں۔ ستمبر میں بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نے پاکستان کے ساتھ غربت کے خاتمے کے منصوبے ''احساس'' کے لیے مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نشو ونما میں کمی کے نتیجے میں بچوں میں ہونے والی قد میں کمی (اسٹنٹنگ) کے مرض کو کم کرنے کے منصوبے، مالی شمولیاتی (فنانشل انکلوژن) اقدامات میں مدد، نومولود، عورتوں اور بچوں میں اموات میں کمی کے لیے عوامی طبی سہولیات کے نظام میں سرمایہ کاری سمیت مختلف سرگرمیوں میں حکومت پاکستان کی مدد کرے گی اور اس حوالے سے 2020 میں پاکستان میں 200 ملین ڈالر خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔

پاکستانی ریاست پر سامراجی اثرات تو واضح ہیں لیکن ملک کے اندر اشرافیہ طبقے کا اثر و رسوخ بھی کچھ کم نہیں۔ ایک طرف سرمایہ دار بین الاقوامی ادارے پاکستان کے مسائل کو بہانہ بنا کر خوب دولت کمارہے ہیں تو دوسری طرف ملک کا سرمایہ دار طبقہ بھی پیچھے نہیں۔ سرمایہ داروں کی ایماء پر حکومت کے کالے قوانین کا نفاذ عروج پر ہے۔ پاکستان کی ہر حکومت سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لیے الگ اور مزدور کسان کے لیے الگ قانون بناتی ہے۔ یعنی طبقاتی فرق عروج پر ہے اور تحریک انصاف کی نئی حکومت نے بھی کچھ مختلف نہیں کیا۔ گیس انفرا اسٹرکچر ڈیولپمنٹ سیس (جی آئی ڈی سی) کی مد میں سابقہ حکومتیں سرمایہ داروں پر واجب الادا رقوم وصول کرنے میں ناکام رہیں۔ دسمبر 2018 کے اختتام تک جہانگیر ترین کی شوگر مل جی آئی ڈی سی کی مد میں کل واجبات 416 بلین روپے تھے۔ اب پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی کے اجلاس میں ڈائریکٹر جنرل گیس کی جانب سے دیے گئے ایک بیان کے مطابق حکومت ایک صدارتی آرڈیننس جاری کرنے کے عمل میں ہے۔ مجوزہ آرڈیننس کے مطابق چار صنعتی شعبہ جات کیمیائی کھاد، کپڑا، بجلی کی پیداوار اور مائع قدرتی گیس پر واجب الادا جی آئی ڈی سی کی نصف رقم معاف کردی جائے گی۔ خبر کے مطابق یہ شدید ناانصافی ہے کیونکہ چھوٹے غریب کسانوں نے یہ واجبات پہلے ہی ادا کردیے تھے لیکن صنعتکاروں نے اسے قومی خزانے میں جمع کرنے سے انکار کردیا اور عدالت سے رجوع کرلیا۔

اس سارے تبصرے کے بعد آخر میں ایک خبر پر نظر ڈالنا بہت ضروری ہے۔ سندھ اسمبلی نے زراعت اور مال مویشی شعبہ میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کو حقوق دینے کے لیے سندھ وومن ایگریکلچر ورکرز بل 2019 منظور کرلیا ہے۔ یہ خبر عورت مزدور کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس کے تحت دیہی آبادی کی نصف آبادی آگے بڑھ کر اپنے آپ کو مزدور کی حیثیت تسلیم کرواسکتی ہے۔

سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اتنے سالوں کے بعد سندھ حکومت کو

بقیہ صفحہ 23 پر دیکھیں

بجٹ 2020-2019: ایک جائزہ

تحریر: ولی حیدر

وزیر مملکت برائے ریونیو حماد اظہر نے 11 جون، 2019 کو بجٹ 20-2019 وفاقی ایوان میں پیش کیا۔ وزیر موصوف نے اپنی تقریر کے آغاز میں کہا کہ تحریک انصاف کی نئی حکومت ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ یاد رہے کچھ اسی طرح کی باتیں سابق وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے اپنی پہلی بجٹ تقریر 14-2013 میں کی تھی۔[1] انہوں نے بھی مسلم لیگ کی حکومت کو ایک نئے دور کے آغاز کا عندیہ قرار دیا تھا۔ حماد اظہر نے بتایا کہ جب ان کی حکومت برسرے اقتدار آئی تو معاشی صورت حال کیا تھی جو درج ذیل میں بیان کی جارہی ہے۔[2]

i۔ مجموعی قرضہ اور واجبات تقریباً 31 ہزار ارب روپے۔

ii۔ بیرونی قرضہ اور واجبات تقریباً 97 ارب ڈالر، بہت سے تجارتی قرضے مہنگے سود پر لیے گئے۔

iii۔ پچھلے دو سالوں میں زرمبادلہ 18 ارب ڈالر سے کم ہوکر 10 ارب ڈالر۔

iv۔ مالیاتی خسارہ میں 20 ارب ڈالر کا تاریخی اضافہ اور تجارتی خسارہ بڑھ کر 32 ارب ڈالر ہوگیا۔

v۔ پچھلے پانچ سالوں میں برآمدات میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔

vi۔ بجلی کے گردیشی قرضہ 1,200 ارب روپے، جس میں ماہانہ 38 ارب روپے کا اضافہ۔

vii۔ مہنگائی چھ فیصد۔

یاد رہے کہ کم و بیش اسی طرح کی باتیں پچھلے وزیر خزانہ نے بھی اپنی پہلی بجٹ تقریر 14-2013 کے موقع پر کی تھیں اور ملک کی معاشی زبو حالی کا رونا رویا تھا۔[3] وزیر مملکت نے کہا کہ ان حالات سے نمٹنے کے لیے موجودہ حکومت نے اس صورتحال کو قابو کرنے کے لیے عملی اقدامات اٹھائے ہیں جو درج ذیل ہیں:

i۔ ٹیکس میں اضافہ اور درآمدات میں کمی، تجارتی خسارہ میں چار ارب روپے کی کمی۔

ii۔ بیرون ملک پاکستانیوں سے دو ارب ڈالر کے ترسیلات میں اضافہ۔

iii۔ بجلی کے گردیشی قرضہ ماہانہ 38 ارب سے کم کرکے 12 سے 26 ملین (2 کروڑ 60 لاکھ) روپے ماہانہ کمی۔

iv۔ چین، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب سے 9.2 ارب ڈالر کی وصولی۔

v۔ برآمدت بڑھانے کے لیے حکومت درج ذیل اقدامات اٹھائے گی:

الف۔ صنعتی اور برآمدی شعبہ کو سستے داموں بجلی اور گیس کی فراہمی۔

ب۔ کم شرح سود پر قرضہ۔

ج۔ برآمدی شعبہ کے لیے خام مال پر درآمدی محصولات کم کرکے 10 ملین (ایک کروڑ) روپے کی کمی۔

د۔ برآمدی پیکیج میں تین سال تک اضافہ۔

ڈ۔ چین سے 313 اشیاء کی ڈیوٹی فری رسائی۔

ان اقدامات سے برآمدات میں اضافہ ہوا۔ کپڑے کی برآمدات میں 16 فیصد، تیار شدہ ملبوسات میں 29 فیصد، پھلوں میں 11 فیصد، سبزیاں 18 فیصد اور باسمتی چاول کی برآمدات میں 22 فیصد اضافہ ہوا۔

vi۔ آئی ایم ایف کے ساتھ چھ ارب ڈالر کا سمجھوتہ ہوگیا ہے، جس کے بارے میں موجودہ مشیر خزانہ حفیظ شیخ نے کہا ہے کہ اس معاہدے کی تفصیلات سے عوام کو آگاہ نہیں کیا جاسکتا۔[4] اس معاہدہ سے درج ذیل فوائد حاصل ہوں گے:

الف۔ ورلڈ بینک اور ایشیائی بینک سے اضافی عالمی مدد کے نتیجے میں دو سے تین ارب ڈالر کی وصولی کا امکان، جنکا شرح سود نسبتاً کم ہوتا ہے۔

ب۔ حکومت کی طرف سے مالی نظم و ضبط اصلاحات کا اشارہ جس کے نتیجہ میں بین الاقوامی سرمایہ اور سرمایہ کاری کے لیے مثبت جواب آئے گا۔

ج۔ ترقی کے لیے پائیدار پلیٹ فارم کا قیام اور معاشی استحکام کا حصول، ان اقدامات کے نتیجہ میں اندازہ ہے کہ رواں مالی سال کا خسارہ سات ارب ڈالر تک کم ہوجائے گا۔

vii۔ معاشی استحکام کے علاوہ حکومت نے درج ذیل اقدمات اٹھائے ہیں:

الف۔ غیر ظاہر شدہ اساسوں کو ظاہر کرنے کے لیے اثاثوں کو ظاہر کرنے کی اسکیم۔ اس اسکیم سے غیر تصدیق شدہ اساسوں کو رسمی معیشت میں شامل کرنے میں مدد ملے گی۔

ب۔ 95 ترقیاتی منصوبوں کے لیے رقم کا اجراء۔

پچھلے چند سالوں سے ہر وفاقی بجٹ کے بعد اس موضوع پر لکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ جب بجٹ تقریر شروع ہوئی تو اندازہ ہوا کہ یہاں بھی پچھلی حکومتوں کی طرح الزامات کا پلندہ کھولنے سے آغاز کیا گیا اور عوام پر مہنگائی کا بم پھینکا گیا۔ تبدیلی پر مبنی وعدوں کے نعرہ دھوکہ ثابت ہوا ہے۔

چونکہ موجودہ مشیر خزانہ کو آئے چند ہفتے ہی ہوئے ہیں اور عمران خان کے سب سے قریبی رفیق اسد عمر کو وزارت خزانہ کے عہدے سے فارغ کردیا گیا ہے۔ قوم امید لگائے بیٹھی رہی کہ وزیر اعظم نے ایک باصلاحیت شخص کو ذمہ داری دی ہے، جس کی حکمت عملیوں کے نتیجہ میں ان کی زندگی میں کچھ آسودگی آئے گی۔ ویسے قوم کی امیدوں پر اس وقت ہی پانی پھر گیا جب اسد عمر کی جگہ مالیاتی اداروں کے پسندیدہ حفیظ شیخ کو وزارت خزانہ کا قلمدان دے دیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق آئی ایم ایف نے اسد عمر سے بات کرنے سے انکار کردیا تھا۔ پاکستان کے بہت سے مستند شخصیات کے مطابق آئی ایم ایف کے کہنے پر اسد عمر کو ہٹایا گیا اور حفیظ شیخ کو مشیر خزانہ بنایا گیا ہے۔[5]

اسد عمر آئی ایم ایف کی ٹیم کے ساتھ ہفتوں سے مذاکرات میں مصروف تھے اور بالآخر حتمی مراحل کی بات چیت کے لیے آئی ایم ایف کے ہیڈ کواٹر بھی گئے مگر اچانک وہاں سے واپسی پر اسد عمر کو فارغ کردیا گیا اور اس کے چند دن بعد ہی حفیظ شیخ کی نامزدگی ہوگئی۔ عجلت میں کیے گئے اس فیصلے پر بہت دنوں تک رائے زنی ہوتی رہی۔ خیال ہے کہ موجودہ مشیر خزانہ ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل شخصیت ہیں انہیں مشرف دور حکومت میں سندھ اور زرداری دور حکومت میں وفاقی وزیر خزانہ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وزیر اعظم عمران خان موجودہ معاشی تباہی کی تمام ذمہ داری پچھلی حکومتوں پر ڈالتے ہیں، پھر کیوں اس ادوار کے وزیر خزانہ کو اپنا مشیر خزانہ لگایا ہے۔ شکوک اور خدشات ناجائز نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ تبدیلی سرکار نے آئی ایم ایف مصر مشن کے سربراہ کو اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا سربراہ مقرر کردیا، جو واشنگٹن سے براہ راست اپنی ذمہ داریاں نبھانے اسلام آباد پہنچے۔ کہا جارہا ہے کہ اب آئی ایم ایف، آئی ایم ایف سے مذاکرات کرے گی۔[6] حیران کن حد تک تبدیلی سرکار نے بھی آئی ایم ایف سے کیے گئے معاہدے کی تفصیلات عوام سے چھپانے کا اعلان کیا ہے جو کہ عوام تک بنیادی معلومات تک رسائی کے برعکس ہے یاد رہے کہ اقتدار سے قبل تحریک انصاف کا یہ ایک بڑا نعرہ تھا۔ کیا عوام ایسی تبدیلی کا انتظار کررہی تھی؟

ناقدین کا کہنا ہے کہ حفیظ شیخ دراصل آئی ایم ایف سے کیے گئے وعدے اور شرائط کو یقینی بنائیں گے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑرہا ہے کہ وزیر اعظم عمران خان نے تباہ شدہ معیشت کو بحال کرنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا ہے جس پر چل کر ملک کی معیشت مزید تباہ تو ہوسکتی ہے مگر اس میں بہتری کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ حقائق گواہی دیتے ہیں کہ دنیا کے جس ملک نے بھی آئی ایم ایف سے قرضہ لیا، اس ملک کی معیشت زمین بوس ہوگئی۔[7] شاید یہی وجہ تھی کہ عمران خان نے کہا تھا ''آئی ایم ایف سے قرضہ لینے سے بہتر ہے میں خودکشی کرلوں گا''۔ مگر ناجانے کیا ہوا وزیر اعظم عمران خان ایک ایک کرکے اپنے تمام پرانے اچھے عوام دوست نظریات و خیالات سے پیچھے ہٹتے چلے جارہے ہیں جن پر یقین کرکے عوام خصوصاً نوجوانوں نے انہیں ووٹ دیا تھا۔ شاید اقتدار کی غلام گردش اسی کا نام ہے۔ بحرکیف آئی ایم ایف سے قرضہ کی منظوری اور اس کے اثرات پر ایک الگ تفصیلی مضمون لکھنے کی ضرورت ہے۔

آیئے اب بجٹ 2019-20 کا جائزہ لیتے ہیں۔ مالی سال 2019-20 کا مجموعی بجٹ 8,238 ارب روپے (تقریباً 82 ہزار ارب روپے) کا ہے۔ جبکہ مجموعی آمدنی کا تخمینہ 7,899 ارب روپیہ (تقریباً 79 ارب روپے) دیکھا گیا ہے۔ اس طرح بجٹ کا مجموعی خسارہ 3,389 ارب کا ہے۔

جدول1: آمدنی کا تخمینہ

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
ٹیکس	3,462,099 (3,462 ارب روپے)	43.82
بیرونی ذرائع	3,032,325 (3,032 ارب، 32 کروڑ روپے)	38.38
صوبوں کی بچی ہوئی رقم	422,995 (422 ارب، 99 کروڑ روپے)	5.35
سرمایہ کاری	831,659 (831 ارب، 65 کروڑ روپے)	10.52
نجکاری	150,000 (150 ارب روپے)	1.89
کل	7,899,078 (تقریباً 7 ارب روپے)	100

Source: Federal Budget 2019-20, Budget in Brief, June, 2019, Government of Pakistan Finance Division Islamabad, page 18.

جدول 1 سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ حکومت نے بھی پچھلی حکومتوں کی طرح ہی براہ راست ٹیکس سے آمدنی کے بجائے بالواسطہ ٹیکس کے ذریعہ آمدنی پر ہی توجہ مرکوز کی ہے۔ گوکہ ٹیکس کی وصولی کے اعداد و شمار پاکستانی تاریخ میں بلند ترین ہیں، ماہرین کے مطابق یہ ایک حقیقت پسندانہ اقدام نہیں، کیونکہ اس ہدف کو حاصل کرنا ممکن نہیں تاوقتیکہ ٹیکس کے وصولی کے نظام میں بڑے پیمانے پر تبدیلی کی جائے۔[8]

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ براہ راست ٹیکس کی مد میں 2,081 ارب اور بالواسطہ ٹیکس کی مد میں 3,473 ارب روپیہ کی وصولی کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ سادہ لوح لوگوں کا خیال تھا کہ تبدیلی والی حکومت ایسے کسی اقدام کو کیسے اٹھائے گی جس سے عوام پر بوجھ بڑھے مگر شومئی قسمت کے یہ اقتدار کا کھیل ہے جہاں مطمع نظر صرف اقتدار کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ عوامی سہولت اور پسے ہوئے طبقات کے لیے مراعات کا وعدہ ہمیشہ ایک فریب رہا ہے۔ بالواسطہ ٹیکسوں کے نتیجہ میں مہنگائی کا سونامی عوام کو کیا کچھ کرنے پر مجبور نہ کردے گا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ یقیناً ایسا قدم آئی ایم ایف کی منشاء کے مطابق اٹھایا گیا ہے۔[9]

دوسری طرف آمدنی کے زمرے میں اس بار نجکاری سے حاصل شدہ رقم بھی رکھی گئی ہے۔ پچھلے مالی سال کے بجٹ میں اس کا ذکر تک نہ تھا، سر نہ دھنے تو اور کیا کریں۔ یہی پی ٹی آئی اور یہی وزیر اعظم اسٹیل مل کی نجکاری کے خلاف سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے تھے[10] اور اب پاکستانی اداروں کی بولی دوبارہ لگنے والی ہے۔ یعنی مزید بے روزگاری، مزید مہنگائی۔

جدول 2: اخراجات کا تخمینہ

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
جاری اخراجات	7,288,179 (7,288 ارب، 17 کروڑ روپے)	88.47
مجموعی ترقیاتی اخراجات	949,895 (949 ارب، 89 کروڑ روپے)	11.53
کل	8,238,074 (8,238 ارب روپے)	100

Source: Source: Federal Budget 2019-20, Budget in Brief, June, 2019, Government of Pakistan Finance Division Islamabad, page 18.

جدول 2 سے پتہ چلتا ہے کہ بجٹ 2019-20 میں مجموعی اخراجات کا تخمینہ 8,238 ارب روپے لگایا گیا ہے جیسے جاری اور ترقیاتی اخراجات میں بانٹا گیا ہے۔ جاری اخراجات کے مد میں تقریباً 7,288 ارب روپے جو کہ مجموعی اخراجات کا تقریباً 88.47 فیصد ہے۔ جبکہ ترقیاتی اخراجات کے لیے 949 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جو کہ مجموعی اخراجات کا تقریباً 11 فیصد ہے۔

یاد رہے کہ پچھلی مالی سال کے بجٹ میں جاری اخراجات مجموعی اخراجات کا تقریباً 80 فیصد تھے۔ جبکہ ترقیاتی اخراجات تقریباً 19 فیصد تھے۔ موجودہ حکومت کے جاری اخراجات تقریباً 88 فیصد جبکہ ترقیاتی اخراجات کے مد میں تقریباً 11 فیصد رکھے ہیں جو کہ پچھلے دور سے کم ہے۔

جدول 2a: جاری اخراجات

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
عمومی عوامی خدمات	5,607,042 (5,607 ارب روپے)	6.93
دفاعی شعبہ اور خدمات	1,152,535 (1,152 ارب روپے)	15.81
امن و عامہ اور حفاظتی شعبہ	152,919 (152 ارب روپے)	2.10
معاشی شعبہ	84,167 (84 ارب، 16 کروڑ روپے)	1.15
ماحولیاتی تحفظ	470 (47 کروڑ روپے)	0.01
رہائشی اور علاقائی خدمات	2,292 (2 ارب، 29 کروڑ روپے)	0.03
صحت اور خدمات	11,058 (11 ارب روپے)	0.15
مذہب، ثقافت اور تفریح	9,838 (9 ارب، 38 کروڑ روپے)	0.13
تعلیم اور خدمات	77,262 (77 ارب، 26 کروڑ روپے)	1.06
سماجی تحفظ	190,595 (190 ارب، 59 کروڑ روپے)	2.62
کل اخراجات	7,288,178 (7,288 ارب، 17 کروڑ روپے)	100

Source: Source: Federal Budget 2019-20, Budget in Brief, June, 2019, Government of Pakistan Finance Division Islamabad, page 23.

جدول 2a کے مطابق مجموعی جاری اخراجات کی 77 فیصد رقم جو کہ تقریباً 5,607 ارب روپے مجموعی عمومی عوامی خدمات کے لیے مختص کی گئی ہے (جس کی تفصیلات جدول 2b میں پیش کی گئی ہیں)۔ مجموعی جاری اخراجات کا 16 فیصد تقریباً 1,100 ارب دفاعی شعبہ اور خدمات کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اس طرح صرف دو شعبوں میں مجموعی جاری اخراجات کی تقریباً 92 فیصد رقم مختص کی گئی ہے۔

جبکہ انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ صحت کے لیے اس حکومت نے پچھلی حکومت سے بھی کم رقم مختص کی ہے جو تقریباً 11 ارب روپے ہے اور مجموعی جاری اخراجات کا 0.15 فیصد ہے۔ اسی طرح تعلیم کے لیے بھی پچھلی حکومت سے کم رقم رکھی گئی ہے۔ جو کہ تقریباً 77 ارب روپے ہے اور مجموعی جاری اخراجات کا 1.06 فیصد ہے جبکہ پچھلی حکومت نے تقریباً دو فیصد رقم مختص کی تھی۔

انتہائی شرم کا مقام ہے کہ جو حکومت انصاف، تعلیم، صحت کے نعروں کے سہارے اقتدار پر قابض ہوئی اسی نام نہاد تبدیلی والی حکومت نے ملک کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل دو اہم شعبوں کے لیے انتہائی قلیل رقم مختص کی ہے۔ قوم کی ترقی اور خوشحالی کھوکھلے نعروں کے بلبوتے پر نہیں بلکہ عوام دوست، کسان دوست اور مزدور دوست پالیسیوں سے ممکن ہے۔ جس کے لیے تعلیم اور صحت کے لیے بجٹ میں خاطر خواہ اضافہ ناگزیر ہے وگرنہ اس ملک میں جیسا پہلے چل رہا ہے ویسے ہی چلتا رہے گا۔ غریب کا بچہ نہ اسکول جاسکے گا اور نہ ہی کسی بیماری کے باعث اسپتال جاسکے گا۔ موجودہ حکومت نے ان دو انتہائی اہمیت کے حامل شعبوں کے لیے بڑی رقم مختص نہ کرکے ثابت کردیا ہے کہ اس ملک میں حکمران طبقے کو حقیقی عوامی ترقی نہیں بلکہ سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور اشرافیہ کی ترقی عزیز ہے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ پی ٹی آئی حکومت میں آکر دوہرے معیار اور طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ کردے گی مگر لگتا ہے کہ اس حکومت کی لگام بھی پچھلی حکومت کی طرح کسی اور کے ہاتھ ہے۔

جدول 2b: عمومی عوامی خدمات

شعبہ	رقم (ملین روپے)	فیصد
سالانہ الاؤنس اور پنشن	421,000 (421 ارب روپے)	7.51
بیرونی قرضوں کی سہولیات/خدمات	359,764 (359 ارب، 76 کروڑ روپے)	6.42
بیرونی قرضوں کی واپسی	1,095,254 (1,095 ارب، 25 کروڑ روپے)	19.53
اندرونی قرضوں کی واپسی/سہولیات	2,531,685 (2,531 ارب، 68 کروڑ روپے)	45.15
دیگر	309,055 (309 ارب روپے)	5.51
بیرونی معاشی امداد	6,422 (6 ارب، 42 کروڑ روپے)	0.11
بشمول صوبوں کو منتقلی	643,391 (643 ارب، 39 کروڑ روپے)	11.47
عمومی خدمات	9,805 (9 ارب، 80 کروڑ روپے)	0.17
بنیادی تحقیق	4,992 (4 ارب، 99 کروڑ روپے)	0.09
عمومی عوام کی ترقی کے لیے تحقیق	14,417 (14 ارب، 41 کروڑ روپے)	0.26
عمومی عوامی خدمات کے لیے انتظامی اخراجات	6,846 (6 ارب، 84 کروڑ روپے)	0.12
عمومی عوامی خدمات جو کہیں اور نہیں	204,410 (204 ارب، 41 کروڑ روپے)	3.65
کل	5,607,041 (5,607 ارب روپے)	99.99

Source: Federal Budget 2019-20, Budget in Brief, June, 2019, Government of Pakistan Finance Division Islamabad, page 23.

جدول 2b سے پتہ چلتا ہے کہ مجموعی عمومی عوامی خدمات میں سب سے زیادہ اندرونی قرضوں کی واپسی جو کہ تقریباً 3,537 (45 فیصد) جبکہ بیرونی قرض کے لیے 1,000 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جو تقریباً دو فیصد ہے۔ یعنی قرضوں کی واپسی کے مد میں مجموعی عمومی عوامی خدمات کا تقریباً 70 فیصد بجٹ مختص کیا گیا ہے۔ جس ملک کے مجموعی بجٹ کا تقریباً 42 فیصد صرف قرضوں کی ادائیگی کے لیے خرچ ہو اس ملک میں عوامی فلاح کیونکر ممکن ہے۔

بجٹ مسودے میں شامل بڑے منصوبوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

1۔ پانی۔ ڈیمز کی تعمیر کے لیے 70 ارب روپے۔

الف۔ دیامر بھاشا ڈیم کے لیے/ زمین کے حصول کے لیے 20 ارب روپے۔

ب۔ مہمند ڈیم کے جاری کام کے لیے 15 ارب روپے۔

2۔ سڑکیں/ ریلوے: سڑکوں اور ریلوے کے منصوبوں میں کچھ ایسے منصوبے بھی شامل ہیں جو کہ سی پیک منصوبہ میں بھی شامل ہیں۔ جس کے لیے 200 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں جس میں سے 156 ارب روپے نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے لیے دیے جائیں گے ۔ اہم منصوبے درج ذیل ہیں:

الف۔ حویلیاں تا تھاکوٹ سڑک کے لیے 24 ارب روپے۔

ب۔ ہریاں تا ہاکلہ موٹر وے کے لیے 13 ارب روپے۔

ج۔ سکھر تا ملتان موٹر وے کے لیے 19 ارب روپے۔

3۔ توانائی: توانائی کے منصوبوں کے لیے 80 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ جس میں سے 55 ارب داسو پن بجلی گھر کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔

زرعی شعبہ: زرعی شعبہ میں پانچ سالہ منصوبے کے لیے 280 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں، منصوبے درج ذیل ہیں:

الف۔ پانی کے منصوبوں جن میں پانی محفوظ کرنے کے چھوٹے منصوبوں کے لیے 218 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔

ب۔ گندم، چاول، گنا اور کپاس کی پیداوار میں اضافے کے لیے 44.8 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔

ج۔ ماہی گیری شعبہ میں جھینگے اور ٹراؤٹ مچھلی کی افزائش اور پیداوار کے لیے 9.3 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔

د۔ چھوٹے اور درمیانے کسانوں کے لیے مال مویشی منصوبوں کے لیے 5.6 ارب روپے مختص کیے ہیں جس میں گھروں میں مرغ بانی اور بچھڑوں کی حفاظت شامل ہیں۔

اس کے علاوہ فصلوں کے بیمہ اور ٹیوب ویل پر زرتلافی کے لیے بھی رقم مختص کی گئی ہے۔

زرعی شعبہ کے حوالے سے کسانوں کی نمائندہ تنظیم پاکستان کسان مزدور تحریک (پی کے ایم ٹی) کے سابق صوبائی رابطہ کار کے پی کے، طارق محمود کا کہنا ہے کہ حالیہ بجٹ میں چھوٹے اور بے زمین کسانوں کے لیے کچھ نہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی صرف بڑے کسانوں کے مفادات کا ہی تحفظ کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ٹیوب ویل پر زرتلافی، فصلوں کی بیمہ پالیسی وغیرہ صرف بڑے جاگیرداروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے۔ پیداوار بڑھانے پر تو توجہ ہے مگر چھوٹے اور بے زمین کسانوں میں زمینی تقسیم اور روایتی بیجوں کے فروغ کے لیے کسی قسم کا بھی اقدام نہیں اٹھایا گیا ہے۔ طارق محمود کا یہ بھی کہنا تھا کہ کسانوں کو منڈی میں مناسب قیمت کے حوالے سے بھی بجٹ میں کچھ نہیں۔ حکومت بین الاقوامی کمپنیوں کو تو زمین دینے کو تیار ہے مگر بے زمین کسانوں میں زمین کے بٹوارے کے حوالے سے ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔[11]

تجزیہ:

یوں تو پچھلے چند دہائیوں سے پاکستان کا بجٹ آئی ایم ایف کی ہدایات کی روشنی میں ہی ترتیب دیے جاتے رہے ہیں مگر حالیہ بجٹ میں جو گہرا شگاف یہ ہے کہ اسے آئی ایم ایف کے براہ راست رہنمائی میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس لیے ٹیکس کی وصولی کا ایک بھاری بھرکم تخمینہ لگایا گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل زکر ہے کہ جب ٹیکس بڑھتا ہے تو عوام کی قوت خرید کم سے کم تر ہوجاتی ہے۔ خصوصاً پاکستان جیسے ممالک میں جس کی تقریباً آدھی آبادی یومیہ 200 روپے کما پاتی ہے۔ اس مہنگائی میں کس حد تک متاثر ہوں گے اس کا اندازہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے۔ آئی ایم ایف کے شرائط کے تحت بجلی، ڈیزل، پیٹرول، گیس کے نرخوں میں کئی گنا اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ دالوں کی قیمت میں فی کلو 15-20 روپے تک کا اضافہ، خوردنی تیل کی قیمت میں 20-40 روپے فی کلو کا اضافہ، آٹے کا پانچ کلو کا پیکٹ میں 20-30 روپے کا اضافہ مہنگائی کے طوفان کی چند مثالیں ہیں۔ ایک خاندان کا ماہانہ راشن کا خرچہ تقریباً 3,000-4,000 تک بڑھ گیا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ آئی ایم ایف کے شرائط کے نتیجہ میں ڈالر کی قیمت میں روز بہ روز اضافہ بھی مہنگائی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ آئی ایم ایف کے شرائط کے تحت منڈی ڈالر کی اتار چڑھاؤ کا فیصلہ کرے گی۔ اسی طرح پیٹرول، ڈیزل، بجلی اور گیس کی قیمت کا فیصلہ بھی پوری طرح نجی شعبہ کے حوالے کرنے کی تیاری ہے۔

معاشی طور پر ایک کمزور ملک کی حکومت مزید معاشی تباہی کی اصولوں پر کاربند ہو کے کس کی خدمت کررہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپوزیشن ٹھیک ہی کہہ رہی ہے کہ موجودہ حکومت عوام کو اپنی ناتجربہ کاری کے بھینٹ چڑھا رہی ہے۔

مقامی سطح پر پیداوار کرنے والے تنگ ہیں۔ کہیں صنعتیں بند ہورہی ہیں تو کہیں صنعتوں سے سینکڑوں کی تعداد میں مزدوروں کو نکالا جارہا

ہے۔ بے روزگاری کے اس دور میں مزید بے روزگاری معاشرے پر کیا اثر ڈالے گی یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کا کسان مزدور طبقہ اس بات کو جان لے کہ نہ پچھلی حکومتیں اور نہ ہی موجودہ حکومت ان کے مسائل کے حل کے لیے سنجیدہ ہے بلکہ یہ وہ تمام حکمت عملیاں اپنا رہے ہیں جس سے عوام کی بے سکونی اور مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔

یہ ایک مسمم حقیقت ہے کہ مقامی پیداواری صنعت کو مضبوط کیے بغیر معاشی استحکام حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ ہماری پیداواری صنعت روز بہ روز سکڑتی جارہی ہے۔ نہ آج کی حکومت اور نہ ہی پچھلی حکومتوں نے اس طرف کوئی خاطر خواہ توجہ دی ورنہ آج ہماری معیشت قرضوں، امدادوں اور بھیک کے سہارے نہ کھڑی ہوتی۔ آج بنگلہ دیش کی معیشت اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ 2018 میں بنگلہ دیش کی مجموعی برآمدات 35.8 ارب امریکی ڈالر جبکہ پاکستان کی 24.8 امریکی ڈالر تھی۔ اسی طرح بنگلہ دیش کی ترقی کی شرح 7.8 فیصد جبکہ پاکستان کی 5.8 فیصد ہے۔ بنگلہ دیش کے زرمبادلہ کے ذخائر 32 ارب جبکہ پاکستان کے آٹھ ارب ہیں۔[12] ہر قوم کی ایک عزت نفس ہوتی ہے، مگر حکمرانوں نے اپنے عیاشیوں کے لیے اجتماعی قومی عزت نفس کو مجروح کرکے رکھ دیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ عمران خان ملکوں ملکوں بھیک مانگنے کے بجائے ملکی معاشی حالات سے نمٹنے کے لیے قومی حکمت عملی کا اعلان کرتے، اپنے لیے اور قوم کے لیے کچھ عرصہ پیٹ پر پتھر باندھ کر، اندھیروں میں رہ کر، روایتی علم اور عوامی سائنس سے استفادہ کرتے ہوئے ایک پائیدار اور مستحکم معیشت کی داغ بیل ڈالتے۔

کسان تنظیموں نے تو مسائل کے حل کے لیے حکمت عملی پہلے ہی پیش کی ہوئی ہے جن میں معیشت اور عوام کو مضبوط کرنے کے لیے فوری طور پر زمینوں کا منصفانہ اور مساویانہ تقسیم کا اعلان اور پیداواری وسائل پر عوام کے اختیار کو یقینی بنایا جانا شامل ہے۔ وقار کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے قومیں قیمت ادا کرتی ہیں اور قومی اجتماعی عزت نفس کا حصول قربانی کے بغیر ناممکن ہے۔ مگر حکمران اور مراعات یافتہ طبقہ اپنی عیاشیوں سے نکلنے کو تیار نہیں اس لیے بھوکی، ننگی اور صحت کی سہولیات سے عاری قوم پھر کسی مسیحا کی منتظر ہے کیونکہ موجودہ مسیحا تو دھوکہ نکلا۔ ان حالات سے نکلنے کا واحد راستہ یکجہتی اور حقیقی عوامی جدوجہد میں ہے جس طرح فرانس میں صرف پیٹرول کی قیمت میں اضافہ پر ہزاروں افراد سڑکوں پر آگئے، ایکواڈور کی عوام نے آئی ایم ایف کے شرائط کے خلاف بھرپور مزاحمت کرکے اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا۔[13] ہمیں بھی منظّم ہو کر جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ خدانہ خواستہ اس قوم کے نصیب میں بے روزگاری، غربت، بھوک، مہنگائی اور بالآخر خودکشی ہی لکھا ہے۔

حوالہ جات

1. Senator Mohammad Ishaq Dar, Federal Minister for Finance, Revenue, Economic Affairs. "Budget Speech 2013-14." P 1. Accessed from http://www.finance.gov.pk/budget/FinalBudgetSpeech_13_14_english.pdf
2. Hammad Azhar, Federal Minister for Revenue. "Budget Speech 2019-20." part 1. P 2. Accessed from http://finance.gov.pk/budget/budget_-speech_english_2019_20.pdf
3. Ibid, Senator Mohammad Ishaq Dar, Federal Minister for Finance, Revenue, Economic Affairs. "Budget Speech 2013-14," p 2. Accessed from http://www.finance.gov.pk/budget/FinalBudget-Speech_13_14_english.pdf
4. Abbasi, Zaheer & Ghumman, Mushtaq. "IMF deal cannot be made public for now: Hafeez." Business Recorder. MAY 26, 2019. Accessed from https://fp.brecorder.com/2019/05/20190526480082/
5. "Global Village Space: Why did Imran Khan replace Asad Umar?." April 19, 2019. Accessed from https://www.globalvillagespace.com/why-did-imran-khan- replace-asad-umar/
6. Nizami, Aif. "Budget Blues." MAY 11, 2019. Accessed from https://www.pakistantoday.com.pk/2019/05/11/budget-blues-2/
7. Brown, Chelsea. "Democracy's Friend or Foe? The Effects of Recent IMF Conditional Lending in Latin America." International Political Science Review (2009), Vol. 30, No. 4, 431–457. Accessed from https://journals. sagepub.com/doi/pdf/10.1177/0192512109342522
8. Ahmed, Dr Vaqar. "PTI's first budget: perceptions vs reality." Jun 11 2019. Accessed from https://www.geo.tv/latest/239981-ptis-first-budget-perceptions-vs-reality
9. Rehman, Dr Fahd. "Content and context of IMF programme." Express Tribune, June 24, 2019. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1998838/2-content-context-imf-programme/
10. Ghori, Habib Khan. "Imran vows to resist privatisation of PIA, Steel Mills." Dawn. March 05, 2018. Accessed from https://www.dawn.com/news/1393249
11. Dawn. "Agri stakeholders say." Dawn, June 17, 2019. Accessed from https://www.dawn.com/news/1488697
12. Hoodbhoy, Pervez. "Why Bangladesh overtook Pakistan." Dawn, February 09, 2019. Accessed from https://www.dawn.com/news/1462757
13. Weisbrot, Mark. "Ecuador Reaches a Deal—but Unrest May Return." October 16, 2019. Accessed from https://www.thenation.com/article/ecuador-protests-imf/

پانی اور اس کی کمی کے مضمرات

تحریر: جنید احمد

زمین پر پانی زندگی کی علامت ہے جس کے بغیر انسان سمیت کوئی بھی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانی تہذیب کا آغاز اور ارتقاء بھی دریاؤں کے ساتھ ساتھ ہی ہوا۔ پانی کے ذریعے ہی خوراک حاصل ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے ہونے والی زرعی پیداوار آج دنیا بھر میں کسی نہ کسی شکل میں تقریباً ہر صنعت کا بنیادی جز ہے۔ دریا، جھیلیں اور ان کے ساتھ زرخیز زمین ہی انسانوں کی معاشرت اور ان کی خوراک کی بنیاد چلی آرہی ہے۔ چاہے دریائے نیل ہو، گنگا، برہم پترا یا پھر دریائے سندھ، آج بھی ان سے جڑے ممالک اور آبادیاں ان آبی وسائل کی بدولت ہی خوراک حاصل کررہی ہیں۔ ان آبی وسائل کے ساتھ قائم آبادیاں ہزاروں سال سے ان وسائل کے پائیدار استعمال، ان سے جڑی حیاتیاتی تنوع کی نگہبان ہیں۔ پانی پر ان آبادیوں کے اجتماعی فطری حق کی ایک تاریخ ہے جو مسلسل آگے بڑھ رہی ہے۔

دور جدید میں آبی وسائل کے استعمال، انتظام اور ان پر اختیار کی کشمکش دنیا بھر میں خوراک کی پیداوار اور صنعتی ترقی کے تناظر میں بڑھتی جارہی ہے کیونکہ دنیا میں موجود کل پانی کا صرف تین فیصد ہی میٹھے پانی پر مشتمل ہے۔ اس کشمکش کا ایک عالمی پس منظر ہے جس کا سفر نوآبادیاتی دور سے شروع ہوکر جدید نوآبادیات میں داخل ہوا جہاں موسمی و ماحولیاتی تبدیلی، بڑھتی ہوئی آبادی کے تناظر میں کم ہوتے ہوئے آبی وسائل اور اس سے حاصل ہونے والی پیداوار پر اختیار کے لیے عالمگیریت پر مبنی معاشی پالیسیاں مقامی آبادیوں کے اس بنیادی حق کا استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں۔ زیر نظر مضمون اس تمام تر استحصال کا پس منظر پاکستان کے تناظر میں واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔

نوآبادیاتی نظام

نوآبادیاتی نظام کے تحت یورپی ممالک اور برطانیہ نے قدرتی وسائل سے مالا مال علاقوں پر قبضہ کیا تاکہ وہاں کے بیش بہا قدرتی وسائل بشمول زرخیز زمین، جنگلات اور نباتاتی و جنگلی حیات کا تجارت اور صنعتکاری میں بھرپور استعمال کیا جاسکے۔ یہ تمام وسائل یقیناً وہیں ممکن ہوتے ہیں جہاں پانی یا دریائی نظام موجود ہو۔ اس کی ایک مثال دریائے نیل ہے جس کے لیے برطانوی سامراج مصر اور سوڈان پر قابض ہوا۔ اسی طرح برصغیر میں بھی دنیا کے بڑے دریائی نظاموں سے سیراب ہونے والے خطے ہندوستان پر بھی برطانیہ ہی قابض تھا۔ برطانیہ کی صنعتوں کے لیے خام مال اور دیگر تجارتی مال کی فراہمی ہندوستان میں تاج برطانیہ کی اولین ترجیح تھی جس کا مقصد برطانوی کارخانوں میں کپڑا تیار کرکے ساری دنیا میں اس کی تجارت تھی۔ اسی مقصد کے تحت ہندوستان بھر میں کپاس، تمباکو، نیل (انڈیگو)، پوست، گنا وغیرہ کی کاشت کو بھرپور طریقے سے فروغ دیا گیا۔

برطانوی قبضہ اور آبی وسائل

متحدہ ہندوستان ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم کے برفانی پہاڑی سلسلے پر واقع ہے جہاں برفانی پہاڑوں یعنی گلیشیئرز کی صورت میٹھے پانی کے دنیا کے بڑے آبی ذخائر موجود ہیں۔ ان برفانی پہاڑوں سے ہی دنیا کے دو بڑے دریائی نظام گنگا برہم پترا اور انڈس جاری ہوتے ہیں۔ ان دو دریائی نظاموں سے جاری ہونے والے دریائے گنگا، یمنا، برہم پترا، چناب، جہلم، سندھ، ستلج جیسے متعدد دریا ہزاروں میل کا سفر طے کرکے وسیع رقبے کو سیراب کرتے ہیں جس کی بدولت یہ خطہ زمین کی زرخیزی، جنگلات، جھیلوں اور جنگلی و آبی حیات سے مالا مال تھا۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان پر قبضے کے بعد اس خطے سے بھرپور پیداوار کے حصول کے لیے دنیا کا سب سے بڑا آبپاشی نظام بھی تعمیر کیا جس کا زیادہ تر حصہ موجودہ پاکستان میں ہے۔ 1947 تک برطانوی تسلط کے دوران تقریباً 75,000 میل نہریں تعمیر کی جاچکی تھیں۔

تقسیم ہندوستان

پانچ جولائی، 1947 یعنی تقسیم سے تقریباً ایک ماہ پہلے پاکستان اور بھارت کی سرحدوں کے تعین کے لیے قائم کیے جانے والے سر ریڈکلف کی سربراہی میں باؤنڈری کمیشن نے پنجاب اور بنگال کو تقسیم کیا جس کے ساتھ ہی ہندوستان

میں دو بڑے دریائی نظام انڈس اور گنگا برہم پترا بھی تقسیم ہوئے۔ برطانوی راج نے دونوں ممالک کی سرحدی حدبندی اس طرح کی کہ پنجاب میں دریائے راوی اور ستلج کے نہری نظام کو کنٹرول کرنے والے فیروزپور اور مادھو پور ہیڈورکس بھارتی پنجاب میں شامل ہوئے جبکہ اس سے جڑا زیادہ تر نہری نظام پاکستان کے حصے میں آنے والے پنجاب میں تھا جو پاکستان کی زرعی معیشت کے لیے انتہائی اہم تھا۔ جس طرح برطانوی سامراج کے لیے میٹھے پانی کے ذخائر اس کی معیشت اور تجارت کے لیے اہم تھے اسی طرح دونوں ممالک کے لیے بھی ان پر اختیار ان کی معیشت اور ترقی کے لیے لازم تھا۔ یوں ان پر قبضے کے لیے دونوں ممالک کے درمیان تنازعات پیدا ہوئے جس کی ابتداء کشمیر سے ہوئی۔

پاک بھارت آبی تنازع اور کشمیر

26 اکتوبر، 1947 کو ریاست جموں و کشمیر کے راجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ الحاق کرلیا جبکہ وہاں اکثریتی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ کشمیر پر اختیار پاکستان کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل تھا کیونکہ ہمالیہ میں انڈس بیسن سے جاری ہونے والے تمام چھ دریا (راوی، ستلج، بیاس، جہلم، چناب، سندھ) کشمیر سے ہی گزرتے ہیں جس کے زیادہ تر حصے پر آج بھی بھارت کا قبضہ ہے اور دونوں ممالک اس خطے پر کنٹرول کو اپنی معاشی بقاء کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس خطے کو پاکستان اپنی شہہ رگ جبکہ بھارت اٹوٹ انگ (لازمی جز) قرار دیتا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد دونوں ممالک کے درمیان آبی تنازعات کے حل کے لیے مختلف مواقع پر مزاکرات اور معاہدوں کا سلسلہ جاری رہا جن کا مختصر احوال مندرجہ ذیل ہے۔

اسٹینڈ اسٹل ایگریمنٹ[1]

دونوں ممالک کے بیچ 18 دسمبر، 1947 کو ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت یہ طے پایا کہ تقسیم سے پہلے کی طرح انڈس بیسن سے پانی کی فراہمی جاری رہے گی۔ چونکہ یہ معاہدہ ایک سال کے لیے تھا، اس کی مدت 31 مارچ، 1948 کو ختم ہوتے ہی بھارت نے یکم اپریل، 1948 کو فیروزپور اور مادھوپور ہیڈورکس سے پاکستان کی حدود میں پانی کی ترسیل بند کردی۔

انٹرڈومینین ایگریمنٹ[2]

پاکستان کو پانی کی بندش کے بعد دونوں ممالک کے درمیان دہلی میں ایک بار پھر مزاکرات ہوئے اور چار مئی، 1948 کو ایک اور معاہدہ عمل میں آیا جسے انٹرڈومینین ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت طے پایا کہ پاکستان بھارت کو پانی کی ترسیل کے بدلے سالانہ رقم ادا کرے گا جب تک کہ پاکستان مغربی دریاؤں سے پانی کی بندش سے متاثر ہونے والے آبپاشی نظام کے لیے متبادل بندوبست نہیں کرلیتا۔

عالمی بینک کا کردار

پاکستان و بھارت کے درمیان جاری آبی تنازع میں عالمی بینک کا کردار اس وقت سامنے آیا جب 1951 میں امریکی ماہر ڈیوڈ لیلن تھائی نے پاکستان اور بھارت کے درمیان آبی تنازع کے حوالے سے ایک تجویز پیش کی کہ ''پاکستان و بھارت کو عالمی بینک کی مشاورت اور مالی معاونت سے ایک معاہدے پر کام کرنا چاہیئے''۔ اس تجویز کے تناظر میں 1954 میں عالمی بینک کے صدر یوجین بلیک نے دونوں ممالک کے درمیان پانی کی تقسیم پر معاہدے کے لیے ایک مسودہ پیش کیا جسے ''انڈس واٹر ٹریٹی'' یا سندھ طاس معاہدہ بھی کہا جاتا ہے۔

سندھ طاس معاہدہ اور سبز انقلاب

عالمی بینک کی ثالثی میں پاکستان و بھارت نے چھ سالہ طویل مزاکرات کے بعد 1960 میں سندھ طاس معاہدے پر دستخط کیے۔ بھارتی وزیر اعظم جوہر لال نہرو اور اس وقت کے پاکستانی صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے 19 ستمبر کو کراچی میں اس معاہدے پر دستخط کیے جس کے تحت انڈس بیسن سے جاری ہونے والے تین دریا راوی، ستلج اور بیاس پر بھارت کا اختیار تسلیم کیا گیا کہ وہ ان دریاؤں کے پانی کو جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ دریائے جہلم، چناب اور سندھ پر پاکستان کا حق تسلیم کیا گیا۔ معاہدے کے تحت بھارت دریائے جہلم اور چناب کے پانی کو روکنے، اس پر آبپاشی نظام قائم کرنے کا اختیار نہیں رکھتا البتہ ان دریاؤں سے پن بجلی کی پیداوار کرسکتا ہے۔ سندھ طاس معاہدے کے نتیجے میں پاکستان اپنے مشرقی دریاؤں کے 21 ملین ایکڑ فٹ پانی سے محروم ہوگیا۔ معاہدے کے مطابق دونوں ممالک

نے مستقل انڈس واٹر کمشنر کا تقرر کیا جو معاہدے کی پاسداری اور پانی کے حوالے سے باہمی تنازعات کے لیے بات چیت اور مزاکرات کا ایک مستقل ذریعہ بھی ہیں۔ دونوں ممالک کے درمیان مستقل بنیادوں پر دریاؤں کے بہاؤ اور اس کے اخراج سے متعلق اعداد و شمار کا تبادلہ بھی اسی معاہدے میں شامل ہے جس کے ذمہ دار دونوں ممالک کے انڈس واٹر کمیشن ہیں۔[3]

اس معاہدے کے تحت ڈیموں کی تعمیر، مشرقی دریاؤں پر بھارت کے اختیار کے بعد ان دریاؤں سے جڑے نہری نظام کو مغربی دریاؤں سے جوڑنے کے لیے لنک کنالوں کی تعمیر، زرعی ضروریات پوری کرنے کے لیے زیر زمین پانی کے اخراج کے لیے سرکاری سرپرستی میں بڑے پیمانے پر ٹیوب ویلوں کی تنصیب جیسے تمام تر اقدامات کے لیے عالمی بینک اور امریکی امدادی ادارے یو ایس ایڈ کی مالی معاونت کے ساتھ ساتھ سبز انقلاب پر مبنی زرعی پالیسیوں کو فروغ حاصل ہوا۔

عالمی بینک 1950 کی دہائی سے ہی تیسری دنیا کے ممالک میں قرض اور امداد کے ذریعے گرین ریولوشن یا سبز انقلاب کے فروغ میں مصروف عمل تھا جس کا براہ راست تعلق آبی وسائل کے استعمال اور ماحولیات سے ہے کیونکہ سبز انقلاب کے تحت متعارف کردہ زیادہ پیداوار دینے والے بیج (HYVs) روایتی بیجوں کے مقابلے کیمیائی کھاد، جراثیم و نباتات کش زرعی زہر ہی نہیں زیادہ پانی بھی مانگتے ہیں جس کے لیے آبپاشی نظام کو وسعت دینا اور زیر زمین پانی کے اخراج میں اضافہ ضروری تھا۔ سبز انقلاب کے تحت متعارف کردہ زیادہ پیداوار والے بیجوں نے مقامی روایتی بیجوں کی جگہ لی جن میں پانی کے اضافی استعمال کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جاسکتا ہے کہ گندم کے روایتی بیجوں کے مقابلے ان درآمدی بیجوں سے کاشت پر تین گنا زیادہ پانی استعمال ہوتا ہے۔ پانی کی اس بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لیے آبپاشی ڈھانچے کی تعمیر کے لیے پاکستان نے عالمی بینک اور دیگر قرض دینے والے اداروں سے قرضے حاصل کیے۔

ڈیموں کی تعمیر

پاکستان میں آزادی کے وقت صرف تین ڈیم موجود تھے۔ خوش دل خان ڈیم (1890) اور اسپن کرازی ڈیم (1945) بلوچستان میں واقع تھے جبکہ پنجاب میں صرف ایک نمل ڈیم (1913) ضلع میانوالی میں موجود تھا۔ سندھ طاس معاہدے کے تحت عالمی بینک اور دیگر ممالک نے پاکستان کی 870 ملین ڈالر کی مالی معاونت کی جس کے ذریعے 1960 سے 1975 کے درمیان منگلا اور تربیلا ڈیم تعمیر کیے گئے جن کی پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش بلترتیب 5.88 ملین ایکڑ فٹ اور 11.62 ملین ایکڑ فٹ تھی۔ اس کے علاوہ مشرقی دریاؤں کا پانی بھارت کو دینے کے بعد ان دریاؤں پر قائم آبپاشی نظام میں پانی کی ترسیل برقرار رکھنے کی غرض سے دریائے جہلم، چناب اور سندھ کو باہم ملانے کے لیے انٹر لنک کنالیں تعمیر کی گئیں جن میں چشمہ۔جہلم اور تونسہ۔پنجند کنال بھی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر زیر کاشت رقبے میں اضافے کے لیے زیر زمین پانی کے استعمال کو بھی فروغ دیا گیا۔ 1960 میں ملک میں 8,000 نجی اور 1,250 سرکاری ٹیوب ویل تھے جن کی تعداد 1970 میں بڑھ کر بلترتیب 90,000 اور 6,525 ہوگئی تھی۔ مجموعی طور پر ٹیوب ویلوں کی یہ تعداد 96-1995 میں بڑھ کر 785،483 تک جا پہنچی اور اس وقت یہ تعداد تقریباً ایک ملین ہے۔ پانی کی دستیابی کے نتیجے میں 61-1960 سے 96-1995 کے دوران ملک میں زیر کاشت رقبے میں 3.43 ملین ہیکٹر اضافہ ہوا اور کل زیر کاشت رقبہ 14.86 ملین ہیکٹر سے بڑھ کر 22.59 ملین ہیکٹر ہوگیا۔ یوں مجموعی طور پر پاکستان میں پانی کی دستیابی جو 61-1960 میں 58.7 ملین ایکڑ فٹ تھی 96-1995 میں 130.9 ملین ایکڑ فٹ ہوگئی۔[4] انڈس کے دریائی نظام پر قیام پاکستان سے پہلے صرف ایک بیراج تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس دریائی نظام پر 19 بیراج، 43 کنال سسٹم، تین بڑے ڈیم اور 12 لنک کنالیں تعمیر ہوئیں۔

عالمی بینک کی ثالثی میں ہونے والے سندھ طاس معاہدے اور اس کے نتیجے میں تعمیر ہونے والے آبپاشی ڈھانچے سے صوبوں کے درمیان آبی تنازعات کو ہوا ملی اس کے ساتھ ساتھ متعارف کردہ سبز انقلاب ٹیکنالوجی نے آبی وسائل کے غیر پائیدار استعمال کو فروغ دیا جس سے زراعت میں پانی کا استعمال 30-20 فیصد سے بڑھ کر 300-200 فیصد ہوگیا۔ عالمی بینک کا آبی ڈھانچے کی تعمیر اور زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت کے لیے کیمیائی مداخل کا استعمال ملکی آبی وسائل کی آلودگی اور ڈیلٹا کے علاقوں میں ماحولیاتی تباہی کا بھی سبب بنا۔ ان اثرات کا مختصر احوال باعنوان درج ذیل ہے۔

پانی کی تقسیم پر صوبائی تنازعات

پانی کی تقسیم کے حوالے سے تنازع کی تاریخ دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

پنجاب اور سندھ کے درمیان دریائے سندھ کے پانی پر تنازع برطانوی راج میں انیسویں صدی کے وسط سے چلا آرہا ہے۔ 1893 میں لارڈ کرزن نے انڈس ریور کمیشن قائم کیا جس نے یہ قرار دیا کہ ''سندھ، بھاولپور، بلوچستان اور بیکانیر (ریاست جوناگڑھ، موجودہ بھارت) کی رضامندی کے بغیر پنجاب پانی کا رخ نہیں موڑسکتا''۔ یہ تنازع 1901 میں دوبارہ سامنے آیا اور انڈین ارییگیشن کمیشن نے پنجاب کے لیے سندھ کی اجازت کے بغیر دریائے سندھ سے ایک قطرہ پانی کا حصول بھی ممنوع قرار دے دیا۔ برطانوی راج میں قائم کیے گئے رائے کمیشن کی سفارشات کے تحت 1945 میں سندھ اور پنجاب کے چیف انجینئر ایک معاہدے پر متفق ہوئے جسے سندھ۔ پنجاب ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت دریائے سندھ کا 75 فیصد پانی سندھ کو اور 25 فیصد پنجاب کو دیا گیا۔ جبکہ دریائے سندھ کے ذیلی دریاؤں (جو پنجاب سے بہتے ہیں) کا 94 فیصد پانی پنجاب اور چھ فیصد سندھ کو دیا گیا۔ اس معاہدے کے ذریعے دریائے سندھ کے تمام دریاؤں کے پانی کی تقسیم کا معاملہ حل ہوا۔ اس معاہدے میں سندھ کی برتری دریائے سندھ پر برقرار رکھی گئی اور دریا کے اوپری علاقوں (اپر ریپیرین) پر سندھ کی رضامندی اور اجازت کے بغیر بہاؤ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جاسکتی تھی۔ تاہم تین سال بعد 1948 میں پنجاب نے تقسیم ہندوستان کو بنیاد بناتے ہوئے پانی کے نئے انتظام کے تحت دریائے سندھ سے پانی لینا شروع کردیا۔[5] بھارتی پنجاب سے پانی بند کیے جانے کی صورت میں صوبہ پنجاب اور سندھ دونوں پانی کی تقسیم کے تنازع کا شکار ہوئے کیونکہ پنجاب کو بھی اب اپنی آبی ضروریات کے لیے دریائے سندھ پر انحصار کرنا تھا جو سندھ کے آبپاشی نظام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

سندھ طاس معاہدے کے بعد دریائے سندھ سے پنجاب کی آبی ضروریات پوری کرنے کے لیے انٹرلنک کنالوں کی تعمیر پنجاب اور دیگر صوبوں کے درمیان پانی تنازعات کا سبب بنی جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سندھ طاس معاہدے سمیت تمام تر آبی ڈھانچے کی تعمیر 1960 سے 1970 کے دوران ہوئی جس وقت مغربی پاکستان انتظامی طور پر ایک اکائی یا ون یونٹ تھا۔ صوبہ سندھ کی حقیقی نمائندگی اس تمام تر پالیسی میں نہ ہونے کی وجہ سے ان تنازعات کو مزید ہوا ملی۔ بدقسمتی سے سندھ طاس معاہدے کی مزاکراتی ٹیم میں بھی سندھ کے حقیقی نمائندے کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس صورتحال میں آبی ڈھانچوں کی تعمیر اور پانی کی تقسیم میں سندھ یا دیگر صوبوں کی مشاورت یا رضامندی کا فقدان تھا جو صوبوں کے درمیان عدم اعتماد اور تنازعات میں شدت کی وجہ بنا اور مزید ڈیموں کی تعمیر کے لیے صوبوں کے درمیان اتفاق نہیں ہوسکا۔ صوبوں کے درمیان یہی عدم اعتماد اور تنازع جنرل ضیاالحق کے دور آمریت 1984 میں اعلان کردہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر میں رکاوٹ بنا جس کے خلاف سندھ بھر سے شدید مخالفت سامنے آئی۔ تینوں چھوٹے صوبوں سے اس ڈیم کی تعمیر کی بھرپور مخالفت ہوئی اور تینوں صوبائی اسمبلیاں اس کی تعمیر کے خلاف قرارداد منظور کرچکی ہیں۔ صوبہ سندھ کا اعتراض ہے کہ چشمہ جہلم اور پنجند لنک کنالوں کی تعمیر اور دیگر موسمی تبدیلی جیسے عوامل کی وجہ سے دریائے سندھ کا بہاؤ پہلے ہی کمی کا شکار ہے۔ اس پر کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے نا صرف ماحولیاتی بحران پیدا ہوگا بلکہ صوبہ سندھ بنجر ہوجائے گا جس کی معیشت دریائے سندھ پر قائم آبپاشی نظام کے ذریعے زراعت پر منحصر ہے۔ جبکہ خیبرپختونخوا کا بنیادی اعتراض ہے کہ ڈیم کی تعمیر سے نوشہرہ اور اس کے اردگرد کا علاقہ زیر آب آجائے گا اور دریا کے زیریں علاقوں میں بہاؤ کم ہو جائے گا جو معاشی تباہی کا سبب بنے گا۔ ڈیم کے ارد گرد ہزاروں ایکڑ زمین سیم و تھور کا شکار ہوگی اور بڑے پیمانے پر مقامی لوگوں کو نقل مکانی کرنی پڑے گی۔ صوبوں کے درمیان آبی تنازعات کی وجہ سے پاکستان میں منگلا اور تربیلا ڈیم کے بعد سے اب تک کوئی بڑا آبی ذخیرہ تعمیر نہیں کیا جاسکا۔ تاہم صوبوں کے درمیان 1991 میں پانی کی تقسیم کے حوالے سے ایک معاہدے واٹر اپائنمنٹ ایکارڈ (Water Apportionment Accord) پر اتفاق ضرور ہوا۔

1991 سے پہلے تک صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم ایڈہاک یعنی عارضی بنیادوں پر کی جاتی تھی۔ چاروں صوبوں کے وزراء اعلی نے پانی کی تقسیم کے طویل تنازع کو حل کرنے کے لیے 16 مارچ، 1991 کو کراچی میں ایک معاہدے پر اتفاق کیا۔ اس معاہدے کے تحت صوبوں کے لیے مختص کردہ پانی کا تناسب مندرجہ ذیل جدول 1 میں دیا گیا ہے۔

جدول1: صوبوں کے درمیان پانی کی تقسیم کے اعداد وشمار

صوبہ	خریف (ملین ایکڑ فٹ)	ربیع (ملین ایکڑ فٹ)	کل مقدار (ملین ایکڑ فٹ)
پنجاب	37.07	18.87	55.94 (48.91 فیصد)
سندھ	33.94	14.82	48.76
خیبرپختونخوا (الف)	3.48	2.3	5.78
سول کنال *(ب)	1.80	1.2	3.00
بلوچستان	2.85	1.02	3.87
کل	77.34	37.01	114.35

* ان گیج سول کنالیں (غیر پیمائش شدہ کنالیں)

حوالہ: انڈس ریور سسٹم اتھارٹی

پانی کی کمی اور اضافہ دونوں صورتوں میں صوبوں کے حصے میں سے پانی کم کیے جانے اور زیادہ فراہم کیے جانے کا تناسب کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ پنجاب 37 فیصد، سندھ 37 فیصد، کے پی 14 فیصد اور بلوچستان 12 فیصد۔[6]

آبی آلودگی اور ماحولیات

انڈس ڈیلٹا دنیا کا پانچواں بڑا ڈیلٹا ہے جو حیاتیاتی تنوع بشمول مچھلیوں کی افزائش اور تیمر کے جنگلات کے ذریعے سمندری طوفان سے تحفظ فراہم کرتا ہے۔ تاہم دریائے سندھ کے بہاؤ اور اس کے ساتھ بہہ کر آنے والی ریت میں کمی اور بڑھتے ہوئے سمندر نے اس ڈیلٹا کے لیے کئی خطرات پیدا کیے ہیں جیسے کہ زیر زمین سمندری پانی اور نمکیات کا بڑھنا اور تیمر کے جنگلات میں کمی۔ 17 ندی نالے جن کے ذریعے دریائی پانی سمندر میں گرتا تھا اب کم ہوکر صرف ایک رہ گیا ہے جبکہ سالانہ اوسطاً 138 دن دریائی پانی ڈیلٹا تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ ڈیموں اور بیراجوں کی تعمیر سے ڈیلٹا تک پہنچنے والی ریت سالانہ 270 ملین ٹن سے کم ہوکر 13 ملین ٹن ہوگئی ہے۔ ڈیلٹا کی تباہی سے مشہور پلا مچھلی اور جھینگے کی پیداوار 90 فیصد کم ہوگئی ہے۔ اسی طرح تیمر کے جنگلات 0.24 ملین ہیکٹر سے کم ہوکر 0.10 ملین ہیکٹر ہوگئے ہیں۔ دریائی بہاؤ میں کمی نے جہاں ماحولیات کو نقصان پہنچایا وہیں سبز انقلاب ٹیکنالوجی کے تحت متعارف کردہ کیمیائی کھاد اور زہریلے اسپرے کے استعمال نے ملکی آبی وسائل کو آلودہ کیا۔ زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کے ساتھ کیمیائی کھاد کا استعمال تیزی سے بڑھا اور 1980-81 میں ایک ملین ٹن، 1992-93 تک دو ملین ٹن اور 2002-3 تین ملین ٹن تک پہنچ گیا۔[7] اسی طرح زہریلے اسپرے کا استعمال 1960 کے وسط میں 7,000 ٹن سالانہ تک جاپہنچا جو 1954 میں صرف 254 ٹن تھا۔ اس کا استعمال 1976-77 میں 16,226 ٹن تک پہنچ گیا تھا۔ 1989 میں زرعی زہر (پیسٹی سائیڈ) کی فروخت اور تقسیم نجی شعبہ کو منتقل کردی گئی جس کے نتیجے میں اس کی فروخت ایک سال میں ہی پانچ گنا بڑھ گئی تھی۔ گزشتہ 20 سالوں میں پاکستان میں زرعی زہر کے استعمال میں 1,169 فیصد اضافہ ہوا۔ 1980 میں اس بے تحاشہ اضافے سے زیر زمین اور سطح پر موجود پانی میں زہریلے مادے پائے گئے۔ سب سے زیادہ متاثرہ علاقوں میں سندھ اور پنجاب کے کپاس کے پیداواری علاقے تھے کیونکہ زرعی زہر کا 80 فیصد استعمال کپاس کی فصل پر ہی کیا جاتا ہے۔[8]

ملک میں 50 ملین افراد زیر زمین پانی میں سنکھیا کی موجودگی کی وجہ سے خطرے کا شکار ہیں۔ زیر زمین پانی کے نمونوں میں سنکھیا کی مقدار 200 مائیکروگرام فی لیٹر پائی گئی جبکہ عالمی ادارہ صحت کی مقرر کردہ حد 10 مائیکروگرام اور حکومت کی مقرر کردہ حد 50 مائیکروگرام فی لیٹر ہے۔ پانی میں آلودگی کا سبب براہ راست گھروں اور صنعتوں سے قریبی دریاؤں، تالابوں، ندی نالوں میں فضلے کا اخراج اور زراعت میں کیمیائی کھاد، زہریلے مواد اور دیگر کیمیائی مادوں کا استعمال ہے۔[9] یہ آبی فضلہ نا صرف تازے پانی کے ذخائر بلکہ زیر زمین پانی میں بھی شامل ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ حد سے زیادہ زیر زمین پانی کا اخراج بھی زیر زمین پانی میں سنکھیا کی مقدار میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ عالمی بینک کی رپورٹ کے مطابق ناقص نکاسی آب کے نظام کی وجہ سے ہر سال 40,000 بچے پانی سے ہونے والی بیماریوں سے جانبحق ہوجاتے ہیں۔[10]

نوآبادیاتی دور میں اس خطے کے عوام اور قدرتی وسائل کے استحصال سے شروع ہونے والا آبی وسائل کا غیر پائیدار استعمال 1960 کی دہائی میں امریکی زرعی ٹیکنالوجی کے ذریعے سبز انقلاب میں تبدیل ہوا جس کے آبی وسائل، ماحول، قومی یکجہتی اور زرعی شعبہ پر پڑنے والے اثرات اوپر بیان کیے گئے۔ اوپر بیان کردہ تمام تر اثرات اور بڑھتی ہوئی آبادی نے ملک کو پانی کی شدید کمی کے شکار ممالک کی فہرست میں لاکھڑا کیا۔

پانی کی کمی: موجودہ صورتحال

پاکستان پانی کی کمی کے شکار 36 ممالک میں شامل ہے جہاں پانی کی دستیابی 1,017 مربع میٹر فی کس ہے۔ آبادی کے تناسب سے پانی کی طلب بڑھتی جارہی ہے اور 2025 تک اس کی طلب 274 ملین ایکڑ فٹ تک بڑھ جانے کا امکان ہے جبکہ دستیاب پانی 191 ملین ایکڑ فٹ رہے گا جس کے نتیجے میں طلب و رسد میں 83 ملین ایکڑ فٹ کا فرق پیدا ہوگا۔ پاکستان کے موجودہ ڈیموں میں صرف 30 دن کا پانی ذخیرہ کرنے کی گنجائش ہے۔[11]

اقوام متحدہ کی موسمی تبدیلی کانفرنس 2018 (کوپ 24) میں انسٹی ٹیوٹ فار انوائرنمنٹل ڈپلومیسی اینڈ سیکیورٹی کی پیش کردہ تحقیق کے مطابق پچھلے 50 سالوں میں انڈس بیسن کے دریائی نظام میں پانی کی سطح 20 سے 30 فیصد کم ہوئی ہے۔[12] دریاؤں میں پانی کی کمی پر انڈس ریور سسٹم اتھارٹی (ارسا) خریف اور ربیع کے موسم میں انتباہ جاری کرتا ہے۔ ارسا کی جانب سے مئی، 2018 میں خریف کے موسم میں سندھ کے لیے 53 فیصد اور پنجاب کے لیے 47 فیصد پانی کی کمی ظاہر کی گئی۔ اسی طرح ربیع کے موسم (2018-19) میں ارسا کی جانب سے ملک بھر میں فصلوں کے لیے 23 فیصد پانی کی کمی کے تناظر میں پانی کے بہتر انتظام کی ہدایت جاری کی گئی۔

ملک میں پانی کی کمی خصوصاً چھوٹے کسانوں کے لیے پانی کی قلت کی وجہ بااثر سیاسی اثر و رسوخ رکھنے والے جاگیردار اور زمیندار بھی ہیں جو افسر شاہی کی ملی بھگت سے پہلے اپنی زمینوں کو سیراب کرتے ہیں جس کے بعد اکثر نہر کے آخری سرے کے کسان پانی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ خصوصاً بدین، ٹنڈو محمد خان جیسے زیریں سندھ کے اضلاع میں کسان گزشتہ تقریباً ایک سال سے پانی کی کمی کی وجہ سے اپنی فصلوں کی بربادی پر سراپا احتجاج ہیں۔

آبپاشی نظام کی خستہ حالی

زرعی پیداواری عمل میں پانی کی کمی اور اس کے زیاں میں آبپاشی نظام کی خستہ حالی بھی کارفرما ہے۔ اس نظام کی خستہ حالی کا اندازہ ان حقائق سے لگایا جاسکتا ہے کہ ملک کے 80 فیصد زیرکاشت رقبے کو سیراب کرنے والے اس آبپاشی نظام میں 35 سے 40 فیصد پانی ضائع ہوجاتا ہے۔[13] محکمہ آبپاشی، حکومت پنجاب کی دسمبر 2018 میں جاری کردہ مسودہ ''پنجاب واٹر پالیسی'' کے مطابق پاکستان کے آبپاشی ڈھانچے جیسے کہ ڈیموں، بیراجوں، کنالوں اور دیگر آبپاشی ڈھانچے کی تبدیلی پر آنے والی لاگت کا تخمینہ 60 بلین ڈالر ہے۔ نہروں، مائنر، واٹرکورس، دروازوں اور دیگر ڈھانچے کی مرمت نہ ہونے کی وجہ سے اس ڈھانچے کی استعداد 30 فیصد کم ہوگئی ہے۔ اگر اس ڈھانچے کے مرمتی اخراجات کو اس کی کل لاگت کا چار فیصد تصور کرلیا جائے تو مرمت پر سالانہ 800 ملین ڈالر درکار ہیں۔ آبپاشی نظام سے آبیانہ کی وصولی کی شرح صرف 60 فیصد ہے اور مزید یہ کہ چاول ہو یا کپاس آبیانہ ایک ہی شرح سے لاگو ہے حالانکہ چاول کی کاشت میں کپاس کے مقابلے 60 فیصد زیادہ پانی استعمال ہوتا ہے۔ 135 روپے فی ایکڑ سالانہ آبیانے کے حساب سے اگر سو فیصد وصولی ہو تو بھی یہ رقم 20 ملین ڈالر سالانہ بنتی ہے جو مجموعی طور پر اس نظام کی مرمت و انتظام کے لیے ناکافی ہے جس کے نتیجے میں اس ڈھانچے کی عدم مرمت ''تعمیر کرو، نظر انداز کرو، پھر تعمیر کرو'' کا ایک شیطانی چکر بن گئی ہے۔ آبپاشی ڈھانچے کی بدحالی اور بدانتظامی کے علاوہ بااثر زمینداروں، جاگیرداروں اور افسر شاہی کی اقرباپروری کی وجہ سے پانی کی غیرمنصفانہ تقسیم بھی اس کی کمی ایک وجہ ہے۔[14]

آبپاشی ڈھانچے کو درست حالت میں رکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر رقم مختص کرنے کی ضرورت ہے جبکہ حکومت کی جانب سے گزشتہ کچھ سالوں میں آبی شعبہ کے لیے مختص کی جانے والی رقم جدول 2 میں پیش کی گئی ہے۔

جدول 2: آبی شعبہ میں مختص کی جانے والی رقوم

سال	بلین روپے
2014-15	47.03
2015-16	57.48
2016-17	95.82
2017-18	105.575
حوالہ: پنجاب واٹر پالیسی 2018	

عالمگیریت اور آبی وسائل

سندھ طاس معاہدے اور سبز انقلاب کی صورت آبی وسائل کے انتظام میں عالمی بینک کا کردار تاحال آبپاشی نظام میں اصلاحات اور پانی سے زیادہ سے زیادہ پیداوار کے حصول کے مقاصد کے لیے کئی منصوبوں کی صورت جاری

ہے۔ جیسے کہ بیراجوں، کنالوں کی مرمت وتعمیر، آبپاشی ڈھانچے پر مرحلہ وار سرکاری اختیار کے خاتمے، پانی کی قیمت میں اضافے، اس کے تحفظ کے لیے جدید آبپاشی نظام پر مبنی ٹیکنالوجی کا فروغ۔ ان منصوبوں میں عالمی بینک کے ساتھ اس کے دیگر کاروباری شراکت دار بھی آبی وسائل کے انتظام کے لیے مدد فراہم کررہے ہیں۔

ورچوئل واٹر

ورچوئل واٹر پانی کی وہ مقدار ہے جو اشیائے صرف کی تیاری میں استعمال ہوتا ہو یا کسی بھی اشیاء کی تیاری کے مراحل میں استعمال ہونے والے پانی کی کل مقدار کو کہتے ہیں۔ مثلاً کسی بھی غذائی اشیاء کی تیاری میں استعمال ہونے والا پانی، اس کی کاشت کے مراحل میں استعمال ہونے والا پانی، اس کی پیکنگ اور ترسیل پر استعمال ہونے والا پانی بھی اس میں شامل ہوتا ہے۔[15] ہر چیز جو ہم استعمال کرتے ہیں اس میں ورچوئل واٹر ہوتا ہے۔ جب کوئی اشیاء یا خوراک ہم برآمد کرتے ہیں، دراصل ہم اپنے آبی وسائل (پانی) برآمد کررہے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم برآمدات کی صورت میں کئی بلین لیٹر پانی ہر سال برآمد کرتے ہیں۔

ورچوئل واٹر کی اصطلاح کو یہاں سمجھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس خطے میں پیداوار کے لیے پانی کی دستیابی ہوگی وہاں زمین کی قدر بھی زیادہ ہوگی اور اس زمین کے حصول کے لیے کشمکش بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی کیونکہ دنیا میں ایسے خطے یا ممالک بھی پائے جاتے ہیں جہاں یا تو آبی وسائل کی کمی ہے یعنی وہاں کوئی دریا نہیں اور وہ صرف بارشوں پر انحصار کرتے ہیں، جیسے کہ مشرق وسطی کے ممالک سعودی عرب، متحدہ عرب امارات وغیرہ۔ یہ ممالک اپنی غذائی ضرورت زیادہ تر درآمدات سے پوری کرتے ہیں۔ سعودی عرب نے 2008 میں خودکفالت کے لیے شروع کیے گئے اپنے 30 سالہ منصوبے کو روک کر ملک میں گندم کی پیداوار میں سالانہ 12.5 فیصد کمی کردی کیونکہ ملک میں زیر زمین پانی کی سطح کم ہورہی تھی جو سعودی عرب کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔[16] مقامی اور ملکی آبی وسائل کو محفوظ کرنے کے لیے یا اسے دیگر منافع بخش پیداوار میں استعمال کرنے کے لیے بھی اس طرح کی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں جیسے کہ چین، جہاں سویا بین کی طلب بڑے پیمانے پر امریکہ اور دیگر ممالک سے درآمد کرکے پوری کی جاتی ہے۔ اسی طرح مشرق وسطی کے ممالک بھارت اور پاکستان جیسے ممالک سے چاول برآمد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کیونکہ وہاں میٹھے پانی کے خاطر خواہ ذخائر نا ہونے کی وجہ سے زیادہ تر زمین بنجر اور صحرا پر مشتمل ہے جہاں اس طرح کی فصلوں کی کاشت تقریباً ناممکن ہے۔

پانی کی کمی اور زرعی پیداوار

پاکستان بحیثیت ایک زرعی ملک گندم، چاول، کپاس اور گنا پیدا کرنے والے دنیا کے بڑے ممالک میں شامل ہے۔ ان فصلوں کی پیداوار میں 80 فیصد نہری پانی استعمال ہوتا ہے۔[17] پاکستان میں گندم کی سالانہ پیداوار 25 سے 26 ملین ٹن کے درمیان رہتی ہے جبکہ ملکی ضرورت تقریباً 24.5 ملین ٹن ہے۔ اسی طرح پاکستان میں چاول کی پیداوار تقریباً سات ملین ٹن اور سالانہ کھپت تقریباً تین ملین ٹن ہے۔ تیسری اہم فصل گنے کی ہے جس کی سال 2017-18 میں پیداوار 82.1 ملین ٹن تھی جو سال 2014-15 کے مقابلے 31 فیصد زیادہ ہے۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ سال 2017-18 میں ملک میں چینی کی پیداوار 7.5 ملین ٹن تھی جبکہ ملکی طلب سالانہ 5.8 ملین ٹن ہے۔[18] پیداوار کے یہ اعداد و شمار ملک کی زرعی پیداوار کو عالمی منڈی میں برآمد کرنے کے رجحان اور پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ صنعتی پیمانے پر نا صرف زرعی زمین غیر ملکی کمپنیوں کو ٹھیکے پر دی جارہی ہے بلکہ اس پر برآمدی زرعی اشیاء و اجناس اگائے جارہے ہیں۔ مثلاً چارے کی پیداوار بھی جاری ہے جسے پانی کی شدید کمی کے شکار خلیجی ممالک برآمد کیا جاتا ہے۔ پاکستان اپنی ضرورت سے کہیں زیادہ گنا، چاول کی پیداوار کررہا ہے جن میں گندم کے مقابلے کئی گنا پانی استعمال ہوتا ہے۔ چارے کی بڑے صنعتی پیمانے پر پیداوار بھی گندم کے مقابلے کئی گنا پانی کے استعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ درج ذیل جدول 3 میں گندم کے مقابلے گنا، چاول اور دیگر نقد آور فصلوں میں پانی کے اضافی استعمال کو واضح کیا گیا ہے۔

جدول 3: مختلف فصلوں میں پانی کے استعمال کا تناسب

فصل	پانی دینے کا عمل
گندم	5 دفعہ
چاول	16 دفعہ
کپاس	7 دفعہ
مکئی	5 دفعہ
گنا	16 دفعہ
حوالہ: پاکستان کونسل آف ریسرچ ان واٹر ریسورسس، 2003	

تجزیہ

دنیا میں دستیاب کل پانی کا صرف تین فیصد حصہ ہی پیداوار کے لیے موزوں ہے جسے میٹھا پانی کہا جاتا ہے۔ یوں پانی ایک ایسی اہم جنس سے جو کسی بھی ملک و قوم کی ترقی اور بقاء کے لیے لازمی جز ہے۔ دو بڑے دریائی نظام انڈس اور گنگا برہم پترا کا حامل ہندوستان جہاں وسیع میدانی علاقہ خوراک اور دیگر اشیاء کی پیداوار کے لیے انتہائی موزوں تھا برطانوی کارخانوں کو خام مال فراہم کرنے، اور ان سے بنی اشیاء کی دنیا بھر میں تجارت کے بدلے بے حساب دولت اور منافع کا سبب بنا۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی معیشت میں پانی کی اہمیت کسی طور صنعتی پیداوار میں استعمال ہونے والے معدنی تیل سے کم نہیں جسے برطانوی سامراج نے بیدردی سے لوٹا اور اس خطے کو منافع کے لیے مخصوص پیداوار کے حصول کا ذریعہ بنا کر یہاں بھوک اور قحط کا بازار گرم کیا۔

برطانوی سامراج نے سینکڑوں سال ہندوستان پر ''تقسیم کرو حکومت کرو'' کے فلسفے کے تحت عوام میں تنازعات و تفریق پیدا کرکے ان کا استحصال کیا اور یہی فلسفہ تقسیم ہندوستان میں بھی استعمال کرتے ہوئے حد بندی کے ذریعے پاکستان و بھارت دونوں کے درمیان تنازع اور دشمنی کا بیج بودیا۔ انڈس اور گنگا برہم پترا کا زیریں علاقہ (موجودہ بنگلہ دیش) پاکستان کے اور بالائی علاقہ بھارت میں شامل کرکے پاکستانی معیشت کو تو خطرے سے دوچار کیا ہی گیا ساتھ ہی دونوں ممالک کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والے تنازع کا آغاز ہوا جس کے نتیجے میں آج تک جنگی جنون میں مبتلا ہوکر دونوں ممالک سامراجی قوتوں کو نفع پہنچارہے ہیں۔

سبز انقلاب کی ''کرشمہ سازی''

سبز انقلاب جدید نوآبادیاتی نظام کی ایک شکل میں اس خطے پر نوآبادیاتی نظام ختم کرکے مسلط کیا گیا تاکہ اس خطے کی معیشت اور وسائل پر اختیار برقرار رکھا جاسکے اور عوام معاشی طور پر بھی سامراج کے غلام بنیں رہیں۔ برطانوی سامراج سے نکلنے والی دونوں ریاستیں پاکستان و بھارت اس امریکی زرعی ٹیکنالوجی کی بڑی منڈی تھے جہاں آبی وسائل کی بدولت معیشت زرعی پیداوار پر انحصار کرتی تھی۔ برطانوی سامراج میں ''کمپنی'' نے ہندوستان میں جو کردار ادا کیا تھا وہی کردار امریکی سامراج نے نوآبادیاتی تسلط سے آزاد ہونے والے بھارت و پاکستان میں ادا کیا، فرق صرف اتنا تھا کہ ''کمپنی'' نے بندوق و بارود اور غلام مزدوروں کا استعمال کیا جبکہ امریکی سامراج نے پاکستان کے اشرافیہ طبقہ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرتے ہوئے ان ممالک میں سبز انقلاب ٹیکنالوجی کے ذریعے زرعی پیداوار اور کسانوں کو غیر ملکی بیجوں اور دیگر مداخل کا محتاج بناکر کسانوں اور پیداواری وسائل کا استحصال کرکے منافع کا حصول ممکن بنایا۔

امریکی سامراج نے اپنی زرعی ٹیکنالوجی فروخت کرکے منافع کے حصول اور پاکستان کی خوراک و زراعت پر قبضے کے لیے آبی وسائل کا جو استحصال کیا اس کی قیمت اس ملک کے عوام کئی صورتوں میں چکارہے ہیں۔ زرعی پیداوار میں کھاد اور اسپرے کی صورت کیمیائی مواد کا استعمال سبز انقلاب کے تحت ہی متعارف ہوا جس سے آلودہ ہونے والے آبی وسائل ملک بھر میں ان وسائل سے روزگار حاصل کرنے والی مقامی آبادیوں میں بھوک اور غربت میں اضافے کی وجہ بنے۔ منچھر جھیل، کینجھر جھیل، راول جھیل اس کی صرف چند مثالیں ہیں جہاں دہائیوں سے آباد بستیاں مچھلیوں اور دیگر آبی حیات کی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے اپنے روزگار سے محروم ہورہی ہیں۔ سبز انقلاب کے لیے پانی کی اضافی ضرورت پوری کرنے کے لیے آبپاشی ڈھانچے کی تعمیر نے دریائی بہاؤ اور سمندر میں دریائی پانی کے اخراج میں کمی کی صورت ڈیلٹا کے علاقوں کو بنجر بنا دیا ہے جہاں کبھی چاول، گنا اور دیگر فصلیں کاشت کی جاتی تھیں۔ سمندری پانی کے بڑھنے سے ساحل کے ساتھ آباد قدیم آبادیاں زراعت کے لیے تو دور آج پینے کے پانی سے بھی محروم ہیں۔

عالمگیریت اور آبی وسائل

دنیا بھر میں منافع کے حصول کے لیے قدرتی وسائل تک سرمایہ دار ممالک اور ان کی کمپنیوں کی باآسانی رسائی اور ان وسائل کی بدولت صنعتی و زرعی پیداوار کی آزانہ تجارت کو 90 کی دہائی میں عالمی تجارتی ادارے (ڈبلیو ٹی او) جیسے اداروں نے ممکن بنایا۔ نوآبادیاتی نظام کی یہ جدید شکل پاکستان جیسے تیسری دنیا کے ممالک میں آج آبی وسائل سمیت تمام تر وسائل کی لوٹ مار ''جدت پر مبنی پیداوار اور برآمد پر مبنی معیشت'' کے نام سے فروغ پا رہی ہے جس نے زراعت کو ایک مہنگی تجارت بنا دیا ہے جس سے اس ملک کے چھوٹے اور بے زمین کسان مزدور قرض، غربت، بھوک، غذائی کمی اور بیروزگاری کے شکنجے میں کس کر رہ گئے ہیں۔

ملک میں پانی کی شدید کمی کے باوجود عالمی منڈیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عالمی سرمایہ داروں کے مقامی ایجنٹ چاہے وہ چینی کی صنعت ہو یا چاول کے برآمد کنندگان یا ملکی آبی وسائل کا بے رحمانہ استحصال کرکے گھاس اور مویشیوں کا چارہ اگانے والی غیرملکی کمپنیاں، مقامی آبی وسائل ہی نہیں زمینی قبضے کی صورت مقامی آبادیوں کا استحصال کررہی ہیں جنہیں ''کارپوریٹ آرڈننس'' کی صورت مکمل سرکاری تحفظ حاصل ہے۔

ملک میں زرعی شعبہ میں پانی کی کمی پر قابو پانے کے منصوبوں کے تحت نت نئی ٹیکنالوجی متعارف کروائی گئی ہیں جن پر حکومت پاکستان زرتلافی بھی فراہم کررہی ہے۔ ان میں قطرہ قطرہ آبپاشی نظام، اسپرنکلر آبپاشی نظام بھی شامل ہیں جنہیں نیسلے جیسی بین الاقوامی غذائی کمپنیاں عالمی بینک اور دیگر شراکت داروں کی مدد سے فروغ دے رہی ہیں۔ جبکہ خود نیسلے کمپنی ملک میں بڑے پیمانے پر زیرزمین پانی کا اخراج کرکے اربوں روپے سالانہ منافع کمارہی ہے۔ مقامی آبی وسائل کو مقامی آبادیوں کو ہی فروخت کرکے منافع کمانے کی یہ صرف ایک چھوٹی سی مثال ہے جس پر سپریم کورٹ از خود نوٹس لینے پر مجبور ہوگئی لیکن بالآخر ان کمپنیوں کے لیے پانی کا نرخ 25 پیسے فی لیٹر کے بجائے ایک روپیہ فی لیٹر مقرر کردیا گیا جیسے کوئی ''صدیوں کی غلامی کا خراج وصول کرلیا ہو''۔

برطانوی نوآبادیاتی دور سے امریکی سبز انقلاب تک اور اب نیولبرل معاشی نظام میں پیداواری وسائل بشمول آبی وسائل پر قبضہ، لوٹ مار اور اس کے غیر پائیدار استعمال کا سلسلہ شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ اب چینی سامراج نے چین پاکستان اقتصادی راہداری (سی پیک) منصوبوں کے ذریعے اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کی ٹھان لی ہے۔ دریائے سندھ کے نظام میں 20 سے 30 فیصد پانی کی کمی کی وجہ سے ملک پانی کی شدید کمی کے شکار ممالک کی فہرست میں شامل ہوچکا ہے اور ارسا خود ربیع کے موسم میں پانی کے محتاط استعمال اور اسے ذخیرہ کرنے کی ہدایت جاری کرتا ہے اور اکثر جہاں چھوٹے کسان پانی کی قلت کی وجہ سے گندم جیسی ربیع کی اہم غذائی فصلوں کی کاشت سے محروم رہ جاتے ہیں، لیکن چینی اور عالمی منڈی کی غذائی اور صنعتی ضروریات پوری کرنے کے لیے ملک بھر میں خوراک اور دیگر اشیاء کی پیداوار اور اس کی قدر میں اضافے (ویلیو ایڈیشن) کے لیے نوصنعتی زون قائم کرنے کی منصوبہ بندی سراسر خودحکومتی پالیسیوں کا تضاد اور اس ملک پر سامراجی تسلط کا تسلسل ہے۔

حوالہ جات

1. Sashikumar VK. "Why the Indus Water Treaty has stood the test of time." Herald, September 30, 2016. Accessed from https://herald.dawn.com/news/1153544
2. Ibid.
3. Abro Altaf, Shah Nafisa. "Water and conflict: the case of upper Sindh" in "The politics of managing water," Bengali, K (ed). Sustainable Development Policy Institute, 2003, p. 152.
4. World Bank. "Indus Waters Treaty 1960." Accessed from https://siteresources.worldbank.org/INTSOUTHASIA/Resources/ 223497-1105737253588/IndusWatersTreaty1960.pdf
5. Briscoe John, Qamar Usman. "Pakistan's water economy: running dry." Oxford University Press and The World Bank, 2008, p. 100. Accessed from http://documents.worldbank.org/ curated/en/989891468059352743/pdf/443750PUB0PK0W1Box0327398B01PUBLIC1.pdf
6. Pakistan Bureau of Statistics. "50 Years of Pakistan:volume-I (1947-1997)." Pakistan Bureau of Statistics, Agriculture, 2014. Accessed from http://www.pbs.gov.pk/sites/default/files/ 50_years_statistics/vol1/6.pdf
7. Hadi, Abdul. "Environmental injustice in Pakistan: impacts of upstream dams on Indus delta and its inhabitants." Academic Journal of Interdisciplinary Studies, 2015, p. 12. Accessed from https://www.researchgate.net/publication/277899770_ Environmental_Injustice_in_Pakistan_Impacts_of_ Upstream_Dams_on_Indus_Delta_and_its_Inhabitants
8. Gadi, Mushtaq. "Re-Colonizing the Indus Basin Irrigation System" in "The politics of managing water," Bengali, K (ed). Sustainable Development Policy Institute, 2003, p. 101.
9. Hayat Khan, Ahmed. "Water sharing dispute in Pakistan: standpoint of provinces." Berkeley Journal of Social Sciences, 2014, Vol. 4. Accessed from https://hostnezt.com/cssfiles/pakistanaffairs/Water%20Sharing% 20Dispute%20in%20Pakistan%20-Standpoint%20of%20Provinces.pdf
10. Hayat Khan, Ahmed. "Water sharing dispute in Pakistan: standpoint of provinces."

11. Indus River System Authority. "Apportionment of the waters of the Indus River System between the provinces of Pakistan." IRSA, 2011. Accessed from http://pakirsa.gov.pk/WAA.aspx
12. Ibid.
13. Ali, Z. "Degradation of Indus Delta costs over $2b a year: World Bank." The Express Tribune, February 9, 2019. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1906500/1-degradation- indus-delta-costs-2b-year-world-bank/
14. FAO. "Fertilizer use by crop in Pakistan." Food and Agriculture Organization of the United Nations, Rome, 2004, p. 11. Accessed from http://www.-fao.org/3/a-y5460e.pdf
15. Tariq, Muhammad et al. "Pesticides exposure in Pakistan: a review." Environment International, Volume 33(8), 2007, pp 1107-22. Accessed from https://www.researchgate.net/ publication/6074422_Pesticides_exposure_in_Pakistan_A_review
16. DAWN. "50 million at risk of arsenic poisoning in Pakistan." DAWN, August 24, 2017. Accessed from http://www.dawn.com/ news/1353482/50-million-at-risk-of-arsenic-poisoning-in- pakistan?preview
17. Daily Times. "Per person water availability in Pakistan is low: World Bank." Daily Times, February 7, 2019. Accessed from https://daily-times.com.pk/352200/per-person- water-availability-in-pakistan-is-low-world-bank/
18. International Monetary Fund. "Issues in managing water challenges and policy instruments: regional perspectives and case studies." International Monetary Fund, 2015, p. 12. Accessed from https://www.imf.org/external/ pubs/ft/sdn/2015/sdn1511tn.pdf
19. Saeed Khan, Rina. "Water levels drop by 30% in Indus Basin." The Express Tribune, December 9, 2018. Accessed from https://tribune.com.pk/story/1863097/1-water-levels-drop-30-indus-basin/
20. Business Recorder. "Sindh & Punjab: water shortage for kharif season soars to 41 percent." Business Recorder, May 16, 2018. Accessed from https://fp.brecorder.com/2018/05/20180516371884/
21. Business Recorder. "Rabi season 2018-19: IRSA projects 38 percent water shortage." Business Recorder, October 2, 2018. Accessed from https://fp.brecorder.com/2018/10/20181002412003/
22. Hasan Khan, Mahmood. "Enormous waste of water." DAWN, June 13, 2016. Accessed from https://www.dawn.com/news/1264520
23. Government of the Punjab, Irrigation Department. "Water Policy." Strategic Planning & Reform Unit, Irrigation Department, Government of the Punjab. December, 2018. P. 35. Accessed from http://extwprlegs1.fao.org/docs/pdf/pak191275.pdf
24۔ احمد جنید۔ ''پاکستان کا آبپاشی نظام: اصلاحات یا نجکاری''۔ چیلنج، ستمبر تا دسمبر،2015، صفحہ34۔
25. Food & Water Watch. "Virtual water." Food & Water Watch, 2020. Accessed from https://www.foodandwaterwatch.org/insight/virtual-water
26. Karam, Souhail. "Saudi Arabia scraps wheat growing to save water." REUTERS, January 8, 2008. Accessed from https://www.reuters.com/article/idUSL08699206
27. Daily Times. "Per person water availability in Pakistan is low: World Bank."
28. Rehman, Shoaibur. "Pakistan sugar production and exports could decline in 2018/19." Business Recorder, February 5, 2018. Accessed from https://www.brecorder.com/2018/02/05/397201/ pakistan-sugar-production-and-exports-could-decline-in-201819/
29. Business Recorder. "Understanding water economy of major crops." Business Recorder, November 20, 2019. Accessed from https://www.brecorder.com/2019/11/20/545919/ understanding-water-economy-of-major-crops/

بقیہ حقیقتیں تلخ تلخ

عورت زرعی مزدور کو تسلیم کرنے کا خیال کیوں آیا؟ شاید چین کا زرعی شعبہ میں بڑھتا ہوا کردار اور سی پیک کے تحت دو ایکنامک زونز جو کہ خیر پور اور دھابیجی میں بننے ہیں میں عورت مزدور کی ضرورت پڑے گی اور اس کے لیے یہ اقدام اٹھائے جارہے ہیں۔ بحرحال حکمران طبقہ کے ارادے کچھ بھی ہوں یہ قانون بہت مفید ہے۔ اب مزدور کسان تنظیموں پر ہے کہ وہ اس قانون کا عورت مزدور کے مفاد کے لیے بھرپور طور پر تنظیم سازی کریں اور مزدوروں کو اپنا حق لینے کے لیے متحرک کریں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مزدور تنظیمیں اس حوالے سے متحرک نظر آرہی ہیں۔

ٹیاری میں عورتوں کی پہلی یونین رہنما شبانہ خاتون نے کراچی میں پریس کانفرنس کے دوران کپاس چننے والی عورتوں کو درپیش مسائل کی نشاندہی کی۔ ان کا مطالبہ ہے انہیں صنفی مزدور کے برابر درجہ دیا جائے اور تمام تر مراعات بھی فراہم کیے جائیں۔ یہاں یہ نقطہ اجاگر کرنا ضروری ہے کہ کپاس کی پیداوار کم سے کم ہوتی جارہی ہے اور اس شعبے سے جڑی لاکھوں مزدور عورتوں کی روزی شدید متاثر ہے۔

آنے والے سالوں میں متحرک مزدور کسان تنظیموں کی اشد ضرورت ہے۔ اس ایک سال کی خبروں سے واضح ہے کہ صنعت کاروں کی کئی شعبوں پر نظر ہے۔ اگر چین پاکستان میں کڑھائی کی صنعت میں حصہ لینا چاہ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ پاکستان کی گھریلوں صنعت سے جڑی ہوئی لاکھوں عورتوں پر اس سرمایہ داروں کا شدید اثر پڑے گا۔ اسی طرح اگر کپاس کی پیداوار خرید گرتی گئی تو بھی زرعی مزدور عورت کی روزی پر بہت بڑا اثر آئے گا۔ بھی جبکہ حکومت خود غیر رسمی شعبوں میں مزدوروں کو مزدور تسلیم کررہی ہے تو مزدور طبقہ کو بڑھ چڑھ کر اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ یونین سازی، تنظیم سازی کے تحت شراکت داری کی بنیادوں پر حقوق لینے کی جدوجہد کو تیز سے تیز تر کیا جائے۔

خصوصی تحریر: گندم کا بحران

خصوصی رپورٹ

پاکستان بھر میں عوام گندم اور آٹے کی قیمت میں تیزی سے ہوتے اضافے سے پریشان ہیں اور اس کی مناسب یا سرکاری قیمت کو یقینی بنانے والے تمام تر ادارے چاہے و وفاقی ہوں یا صوبائی مہنگائی کے اس بے قابو ہوتے جن کو بوتل میں بند کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک سال پہلے تک گندم کے وافر ذخائر سے پریشان وفاقی اور صوبائی حکومتیں اس کی برآمد کے لیے جتن کررہی تھیں اور حکومت کی جانب سے بارہا اس کے لیے مراعات بھی فراہم کی گئیں۔ ملک میں گندم اور آٹے کے بحران کی ذمہ دار چاہے حکومت ہو یا تاجر یا مل مالکان یا توانائی اور دیگر مداخل کی بڑھتی ہوئی قیمتیں، حقیقتاً یہ بحران اس ملک کے غریب عوام سے روٹی کا نوالہ بھی چھین لینے کے مترادف ہے۔ زیر نظر تحریر گندم اور آٹے کے بحران کی وجوہات اور اس سے جڑے شراکتداروں کا کردار واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یقیناً اس کے لیے گندم کی پیداوار، اس کی سرکاری قیمت، سرکاری خریداری اور پیداوار و کھپت سے متعلق پس منظر کو جاننا ضروری ہے۔

گندم کی پیداوار اور ذخائر

سال 2018-19 میں گندم کی پیداوار منڈی میں آنے سے پہلے حکومت کے پاس تقریباً 4.5 ملین ٹن گندم موجود تھا، یاد رہے اس مقدار میں حکومت کی ہنگامی یا دفاعی حکمت عملی کے تحت محفوظ کردہ ایک ملین ٹن گندم شامل نہیں ہے۔ حکومت کے ہی اعداد و شمار کے مطابق اس سال گندم کی پیداوار 25.1 ملین ٹن تھی۔ یوں اگر اس تمام مقدار کو جمع کیا جائے تو ملک میں 29.6 ملین ٹن گندم موجود تھی۔ جبکہ ملکی مجموعی گندم کی طلب سالانہ 25.84 ملین ٹن ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں 3.76 ملین ٹن ضرورت سے زائد گندم موجود تھی۔ اس تناظر میں پاکستان میں ضرورت سے زائد گندم ہونے کے باوجود ملک میں گندم اور آٹے کا بحران اور اس کی قیمت میں اضافے کے ممکنہ عوامل یہ ہوسکتے ہیں۔

گندم کی سرکاری خریداری اور عالمی بینک

گندم کی سرکاری خریداری، اس کے سرکاری ذخائر اور اس کی بروقت ترسیل گندم و آٹے کی قیمت پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے جو بنیادی عوامی خوراک ہے۔ پاکستان ایگری کلچرل اسٹوریج اینڈ سروسس کارپوریشن (پاسکو) اور خوراک کے صوبائی محکموں کے پیش کردہ اعداد و شمار کے مطابق اقتصادی رابطہ کمیٹی کے سال 19-2018 کے گندم کی خریداری کے مقرر کردہ ہدف 6.250 ملین ٹن کے مقابلے مجموعی طور پر 4.034 ملین ٹن گندم خریدا گیا جو مقررہ ہدف کے مقابلے 35 فیصد کم تھا۔ مسلم لیک ن کی گزشتہ حکومت نے گندم کی پیداوار اور اس کی منڈی پر سے سرکاری اختیار ختم کرنے کی ابتداء کی تھی جو موجودہ تحریک انصاف حکومت میں بھی جاری رہی۔ فروری، 2018 میں زرعی منڈی میں اصلاحات کے لیے پنجاب حکومت نے عالمی بینک کے ساتھ ایک منصوبے کا آغاز کیا تھا جسے ''اسٹرینتھنگ مارکیٹ فار ایگری کلچر اینڈ رورل ٹرانسفورمیشن ان پنجاب'' یا اسمارٹ پروگرام بھی کہا جاتا تھا۔ اس منصوبے کے تحت پنجاب حکومت کو مرحلہ وار گندم کی سرکاری خریداری کم کرتے ہوئے اسے سال 2019 میں تین ملین ٹن تک محدود کرنا تھی اور 2021 میں گندم کی سرکاری خریداری سے مکمل طور پر الگ ہونا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ گندم کے سرکاری ذخائر کو دو ملین ٹن تک محدود کرنا تھا۔ اس منصوبے کے تحت ہی سال 18-2017 میں پنجاب حکومت نے گزشتہ سال کے ہدف 4.5 ملین ٹن کے برعکس صرف چار ملین ٹن گندم کی خریداری کا ہدف مقرر کیا۔

اسی طرح سال 19-2018 کے لیے وزیر خوراک پنجاب سمیع اللہ چوہدری نے دعوی کیا کہ صوبائی حکومت 130 بلین روپے کی لاگت سے گندم خریدے گی اور اس مقصد کے لیے رقم کی منظوری دی جاچکی ہے۔ خیال رہے کہ پنجاب حکومت نے گندم خریداری پالیسی جاری کرتے ہوئے گندم کی خریداری کا ہدف واضح نہیں کیا، مئی میں وزیر ریونیو پنجاب ملک محمد انور نے ایک بیان میں آگاہ کیا کہ پنجاب حکومت چار ملین ٹن گندم خریدے گی۔ زرعی پیداوار میں بڑھوتری میں کمی اور کسانوں کے ردعمل پر حکومت نے عالمی بینک کے منصوبے کے برعکس تین کے بجائے چار ملین ٹن گندم خریدنے کا فیصلہ تو کیا لیکن پنجاب حکومت کی گندم کی سرکاری خریداری کے حوالے سے دلچسپی کا اندازہ وزیر خزانہ پنجاب مخدوم ہاشم جوان بخت کے فروری، 2019 میں دیے گئے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ

''پنجاب حکومت گزشتہ دس سالوں میں کسانوں سے گندم کی خریداری، اسے ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کے عمل میں 447 بلین روپے کی مقروض ہوئی ہے۔ غذائی اجناس کے اس سارے عمل سے زیادہ سے زیادہ ہر دس میں سے ایک کسان کو فائدہ پہنچتا ہے لیکن حکومت کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ گندم کی حکومتی خریداری سے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ہم نجی شعبہ کے کردار میں اضافے پر یقین رکھتے ہیں اور حکومت کو ایک سہولت کار کے طور پر دیکھتے ہیں''۔

اگر وزیر خزانہ پنجاب کا اوپر درج بیان حقیقت پر ہی مبنی تھا تو پھر حکومت نے گندم کی قلت کے پیش نظر کیوں اپنا فیصلہ تبدیل کرتے ہوئے گندم کی سرکاری خراداری میں کمی کا اسمارٹ منصوبہ معطل کردیا؟

کسانوں سے گندم کی خریداری کی حوصلہ شکنی

حکومت کی طرف سے گندم کی سرکاری خریداری میں عدم دلچسپی کی وجہ پنجاب میں عالمی بینک کا منصوبہ ہو یا سندھ میں پہلے سے موجود آٹھ لاکھ ٹن گندم کا ذخیرہ، منڈی میں تاجر حکومتی خریداری میں عدم دلچسپی کا فائدہ اٹھاتے ہیں جس کے نتیجے میں گندم کی قیمت منڈی میں کم ہوجاتی ہے۔ اپریل، 2019 کی ایک خبر کے مطابق سندھ میں گندم کی سرکاری خریداری نہ ہونے کی وجہ سے کسان اپنی پیداوار منڈی میں سستے داموں فروخت کرنے پر مجبور ہوئے اور صوبے میں کھلی منڈی میں اس کی قیمت 850 سے 900 روپے فی من تک کم ہوگئی۔

گندم کی برآمد

پنجاب میں گندم کی سرکاری خریداری میں کمی، خریداری میں بدنظمی اور سندھ میں سرے سے صوبائی حکومت کا کسانوں سے گندم نہ خریدنے کی وجہ سے گندم کے خریدار تاجروں نے کسانوں کا استحصال تو کیا ہی دوسری طرف بڑے پیمانے پر کھلی منڈی سے سستے داموں خریدی گئی یہ گندم سندھ، پنجاب سے کے پی اور اس کے بعد افغانستان غیر قانونی طریقوں سے جاتی رہی ہے جس پر کئی بار حکومت کی توجہ دلانے پر بھی کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی گئی۔ آٹھ مئی، 2019 کی ایک خبر کے مطابق حکومت کی جانب سے گندم کی بلامحصول برآمد کی اجازت دینے سے یومیہ ایک لاکھ گندم کی بوریاں افغانستان برآمد ہورہی تھیں۔ تیزی سے افغانستان گندم کی برآمد کی بظاہر وجہ وہاں کی منڈی میں اس کی پرکشش قیمت 1,584 روپے فی من تھی۔ مئی میں ہی سندھ سے پنجاب اور دیگر صوبوں کو گندم کی ترسیل روکنے کے لیے سندھ حکومت نے گندم کی دیگر صوبوں کو برآمد پر پابندی کا فیصلہ کیا۔ وزیر خوراک سندھ کے مطابق سندھ سے یومیہ 10,000 ٹن گندم پنجاب ترسیل کیا جارہا تھا جس کے بعد سندھ حکومت نے پابندی کا فیصلہ کیا۔ آخر کار وفاقی حکومت نے جولائی میں گندم کی برآمد پر پابندی عائد کردی۔ تاہم حکومت نے برآمد کنندگان سے مزاکرات کے بعد فائن آٹا، سوجی اور بیکریوں میں استعمال ہونے والے آٹے کی افغانستان برآمد پر سے پابندی اٹھالی۔ یہاں یہ بات قابل زکر ہے کہ حکومت نے جولائی میں گندم و آٹے کی قانونی برآمد پر پابندی عائد کی جبکہ غیر قانونی طور پر افغانستان گندم و آٹے کی ترسیل جاری رہی۔

گندم کی پیداوار میں کمی

سرکاری سطح پر گندم کی خریداری میں کمی، اس کو غیر قانونی طور پر ملک سے باہر بھیجنے کے ساتھ ساتھ ملک میں گندم کی پیداوار میں کمی بھی ایک وجہ ہے۔ گزشتہ سال اپریل میں کہ جب فصل کٹائی کے لیے تیار ہوتی ہے بارشوں اور ژالہ باری سے گندم کی فصل کو شدید نقصان پہنچا، یقیناً یہ بے موسم بارشیں موسمی بحران کا حصہ تھیں۔ اس وقت کے وفاقی وزیر قومی غذائی تحفظ و تحقیق صاحبزادہ محبوب سلطان کے مطابق بھاری بارشوں اور طوفان سے گندم کی پیداوار میں 1.28 ملین ٹن کمی ہوئی۔ حکومتی سطح پر فصل کی تباہی پر صرف بیانات کی حد تک تشویش کا اظہار کیا گیا اور نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے سروے کا آغاز کرنے کے صرف اعلانات کیے گئے لیکن اب تک اس حوالے سے کوئی ٹھوس اعداد و شمار حکومت کی جانب سے پیش نہیں کیے گئے کہ آیا بارشوں اور طوفان سے کتنے کسانوں اور ان کی پیداوار کو نقصان ہوا۔

گندم مافیا

گزشتہ سال 2018 میں گندم کی کٹائی سے چند ماہ پہلے یعنی فروری میں حکومت نے 500,000 ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ گندم کی برآمد کے لیے پاسکو کو 32,759 روپے فی ٹن کی بولی موصول ہوئی۔ اسی طرح سندھ کابینہ کے اجلاس میں صوبائی حکومت نے بھی کھلی فروخت کے ذریعے

500,000 ٹن گندم فروخت کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی اجلاس میں کابینہ ارکان نے کہا کہ ''گندم کی نئی قیمت کا تعین منڈی پر چھوڑ دیا جائے''۔

ایم ایم گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین، گندم کے بڑے برآمد کنندہ اور وزیر اعظم کے مشیر برائے سمندری امور محمود مولوی نے خود گندم کے بحران کا خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''گندم کی پیداوار میں کمی کی وجہ سے ذخیرہ اندوزی شروع ہوگئی ہے جس کی وجہ سے آنے والے دنوں میں گندم کی قیمت میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ مقامی منڈی میں گندم کی قلت سے بچنے اور اس کی قیمت کو اعتدال میں رکھنے کے لیے ذخیرہ اندوزوں کے خلاف سخت کارروائی کی ضرورت ہے۔ بصورت دیگر عوام کو گندم کے بحران کے لیے تیار رہنا چاہیے''۔

جیسے کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا کہ مئی میں گندم کی برآمد میں تیزی آئی جس کے نتیجے میں پنجاب میں اس کی قیمت میں اضافہ شروع ہوا اور محکمہ خوراک نے بجائے اس کے کہ گندم کی ہر قسم کی برآمد پر بروقت پابندی عائد کرتی ملک بھر میں گھریلو استعمال کے لیے ہونے والی گندم کی ترسیل کی سخت نگرانی شروع کردی جس پر پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن نے بھی احتجاج کیا۔ ملوں کو لے جانے والے گندم کے ٹرک ضبط کیے گئے جس سے ملک بھر میں گندم کی ترسیل متاثر ہوئی جو اس کی قیمت میں مزید اضافے کی وجہ بنی۔ گندم کی قیمت کھلی منڈی میں 1,400 روپے فی من تک جا پہنچی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن، پنجاب نے حکومت کی جانب سے آٹا اور اس سے بنی اشیاء کی افغانستان برآمد پر پابندی کی تجویز پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے آٹے کی اربوں روپے کی صنعت برباد ہوجائے گی۔ گندم کی برآمد پر پابندی ہونی چاہیے لیکن آٹا اور اس سے بنی اشیاء کی برآمد جاری رہنی چاہیے۔

آل پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن ملک میں گزشتہ ایک سال میں جتنی متحرک نظر آئی اس سے پہلے شاید کبھی نہ تھی۔ گزشتہ سال اپریل میں ہی چیئرمین پاکستان فلور ملز ایسوسی ایشن پنجاب حبیب الرحمٰن اور دیگر ارکان نے حکومت سے باضابطہ شکایت کی کہ گندم کی خریداری پالیسی میں بطور نجی شراکت دار ان کا کردار واضح نہیں ہے۔ حکومت نے ان کے لیے مسائل کھڑے کردیئے ہیں اور یہ خدشہ ہے کہ اس عمل سے گندم کی خریداری مہم متاثر ہوسکتی ہے۔ گندم کے نجی خریداروں کو مسائل کا سامنا ہے کیونکہ بینکوں کی عائد کردہ شرح سود زیادہ ہے۔

اوپر بیان کردہ عوامل سے ظاہر ہوتا ہے کہ قومی غذائی تحفظ پر ناصرف حکومت چاہے وہ مسلم لیگ کی ہو یا تحریک انصاف کی بلکہ ملک میں موجود موقع پرست سرمایہ دار، جاگیردار اور برآمد مافیا نے سودے بازی کرکے عوام کو سستے آٹے سے محروم کرکے اربوں روپے منافع بنانے کی سازش کی۔ گو کہ عالمی بینک کا زرعی منڈی میں اصلاحات کا منصوبہ معطل کردیا گیا ہے لیکن درحقیقت پالیسی ساز ملک میں کاروبار میں آسانی پیدا کرنے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سازگار ماحول فراہم کرنے کے لیے ملک میں گندم، دودھ، گوشت اور اس جیسی دیگر لازمی غذائی اشیاء کی قیمت کا اختیار منڈی کے حوالے کرنے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ خصوصاً پنجاب اور سندھ کے وزراء اور پالیسی ساز عوام کو مزید بھوک میں دھکیلنے کے اس گھناؤنے فعل میں برابر کے شریک ہیں۔

ملک میں گندم اور آٹے کی قیمت میں اضافے کی بنیادی وجوہات میں گندم کی بلاروک ٹوک قانونی اور غیرقانونی برآمد ہے جسے غلام ذہنیت پالیسی سازوں نے جان بوجھ کر قابو کرنے کی کوشش ہی نہیں کی بلکہ حکومتی صفوں میں موجود برآمدی مافیا کے دباؤ پر گندم برآمد کرنے کی اجازت بھی دی۔ دونوں صوبوں میں بدعنوان افسر شاہی نے گندم کی سرحد پار ترسیل کو روکنے کے بجائے اندرون ملک اس کی ترسیل پر رکاوٹیں کھڑی کیں جس نے گندم کے حوالے سے مزید افواہوں کو جنم دیا اور گندم کی قیمت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اس دوران وفاقی حکومت نے روایتی نااہلی کا ثبوت دیتے ہوئے گندم کی برآمد پر پابندی میں تاخیر تو کی ہی ساتھ ہی ہنگامی طور پر صوبوں کو پاکستان ایگری کلچرل اسٹوریج اینڈ سروسس کارپوریشن کے گوداموں سے گندم جاری کرنے کا بروقت فیصلہ نہیں کیا۔

حکومت کی جانب سے اس سارے بحران کے دوران ایک بیان تواتر سے سامنے آیا کہ ''ملک میں ضرورت کے مطابق گندم موجود ہے''۔ اعداد و شمار بھی اس دعوی کو درست ظاہر کرتے ہیں لیکن حکومت گزشتہ بجٹ میں عائد کیے گئے بھاری محصولات، روپے کی قدر میں کمی اور آٹا ملوں کو بجلی پر دی جانے والی زرتلافی کے خاتمے کا کہیں زکر نہیں کرتی جو آٹے کی پیداواری لاگت میں اضافے کی وجہ بنا۔ مزید یہ کہ شرح سود میں اضافہ بھی کردیا گیا۔ یقیناً ملوں کو گندم کی ترسیل میں محکمہ خوراک کی جانب سے ڈالی گئی رکاوٹیں، کھلی منڈی میں اس کی بڑے پیمانے پر اسمگلنگ کی وجہ سے قیمت میں اضافہ اور آٹے کی پیداواری لاگت میں اضافے نے اس بحران کو شدید تر کیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمی منڈی سمیت افغانستان میں گندم اور اس سے بنی اشیاء کی برآمد کے منافع بخش کاروبار میں چینی اور گنے کی صنعت کی طرز پر بااثر سیاستدان اور تاجر طبقہ اثر انداز ہوتا جارہا ہے۔ خود وزیر اعظم کے مشیر برائے سمندری امور محمود مولوی ایم ایم گروپ آف کمپنیز کے چیئرمین ہیں جو گندم سمیت زرعی اجناس کی برآمد اور دیگر کئی صنعتوں سے وابستہ ہیں۔ پنجاب حکومت کا سرکاری خریداری کو محدود کرنے اور سندھ کابینہ کے وزراء اور مشیران کا سرے سے گندم کی سرکاری خریداری سے اجتناب ظاہر کرتا ہے کہ چونکہ جاگیردار، زمیندار، تاجر طبقہ خود بڑے بڑے زمینی رقبوں اور ان سے حاصل ہونے والی پیداوار کا مالک ہے، جنہیں آٹے کی قیمت میں ہونے والے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑتا جبکہ ملک کی 80 فیصد سے زیادہ کسان مزدور پیشہ عوام اس سے براہ راست متاثر ہوتی ہے۔

پاکستان میں سال 2007 میں بھی اسی طرح گندم اور آٹے کا بحران پیدا ہوا تھا۔ اس وقت دنیا بھر میں گندم کے جاری بحران کی وجہ سے عالمی منڈی میں گندم کی قیمت میں اضافہ ہوا جس کا مقامی سرمایہ داروں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سستے داموں کھلی منڈی سے خریدا گیا گندم بھاری منافع کے ساتھ برآمد کردیا گیا تھا۔ اس دور کے وزیر اعظم شوکت عزیز پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ انہوں نے ملک سے گندم کی برآمد کا فیصلہ کیا تھا جس کی وزارت خوراک و زراعت نے مخالفت کی تھی۔ 2007 میں 300,000 ٹن گندم ملک سے 185 ڈالر فی ٹن قیمت پر برآمد کیا گیا اور پھر چند مہینوں بعد ہی 1.5 ملین ٹن گندم 400 ڈالر فی ٹن قیمت پر درآمد کیا گیا۔ گندم کی برآمد کا یہ فیصلہ نا صرف گندم کے بحران اور ملک میں آٹے کی قیمت میں اضافے کی وجہ بنا بلکہ اس سے قومی خزانے کو 25.8 بلین روپے کا بھاری نقصان بھی ہوا تھا۔

خیال رہے کہ اب بھی گندم درآمد کرنے کی تدابیر کی جارہی ہیں جبکہ صرف دو مہینے میں سندھ سے گندم کی نئی فصل سے پیداوار آنی شروع ہوجائے گی۔ عجب نہیں کہ گندم کی درآمد کا فیصلہ اس لیے کیا گیا ہوتا کہ اگلی فصل کے منڈی میں آنے پر گندم کی قیمت گرجائے۔ درآمدی گندم کی وجہ سے مقامی کسان کی پیدا کردہ گندم کی قیمت کم ہونے سے تاجر پھر سے سستی گندم خرید کر مہنگا آٹا بازار میں فروخت کرکے عوام کو بھوک سے بلکنے پر مجبور کریں گے۔ پاکستان بدقسمتی سے عالمی امدادی اداروں بشمول عالمی بینک، آئی ایم ایف اور ایشیائی ترقیاتی بینک جیسے اداروں اور سرمایہ دار ممالک کی آزاد تجارتی پالیسیوں کی ایک ایسی تجربہ گاہ کا منظر پیش کررہا ہے جہاں خوراک و دیگر زرعی اشیاء کے پیداواری وسائل سمیت اس کی منڈی پر قبضہ کا سلسلہ تیز تر ہوتا جارہا ہے۔ ملک میں گندم اور آٹے جیسی بنیادی خوراک کا یہ بحران اس قبضے کی صرف ایک کڑی ہے جس کا بنیادی مقصد خوراک کی پیداوار و منڈی پر سے سرکاری اختیار کا خاتمہ کرکے اسے سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ آنے والے وقت میں شاید دودھ جیسی بنیادی خوراک کے حوالے سے بھی ایسی ہی صورتحال پیدا ہونے والی ہے کیونکہ کھلے دودھ کا کاروبار اب چھوٹے پیمانے پر کرنے والے عام آدمی کے ہاتھوں سے زبردستی چھین کر بڑی بڑی کمپنیوں کے حوالے کرنے کی منصوبہ بندی مکمل کرلی گئی ہے۔

حوالہ جات: ''خالص دودھ'' کی سیاست: کمپنیوں کی نئی چال!

5. Government of the Punjab, Punjab Food Department. "The Punjab Food Authority Act, 2011(XVI of 2011)." Accessed from https://food.punjab.gov-.pk/rules_and_regulations
6. Express Tribune. "Punjab Food Authority to ban banaspati ghee." October 11, 2017. Accessed from https://tribune.com.pk/ story/1528800/punjab-food-authority-ban-banaspati-ghee/
7. World Trade Organization. "Understanding the Sanitary and https://www.wto.org/english/tratop_e/sps_e/spsund_e.htm
8. Bogdandy, Armin von, "Law and Politics in the WTO - Strategies to Cope with a Deficient Relationship", Vol. 5 (2001), 609-674 accessed from https://www.mpil.de/-files/pdf1/mpunyb_von_bogdandy_5.pdf
9. Boisrobert, Christine et al (eds). "Ensuring global food safety: exploring global harmonization." Elsevier Inc. 2010.
10. Ibid.
11. Bogdandy, Armin, p. 637.
12. Bogdandy, p. 637-638.
13. Clapp, Jennifer and Fuchs, Doris (Eds.). "Global power in agrifood governance." MIT Press, England, 2009. P. 14.
14. Ibid, p. 98.
15. Steier, Gabriela and Patel, K Kiran (Eds). "International food law and policy." Springer International Publishing, Switzerland, 2016. P. 24.
16. Clapp & Euchs, p.38.

گنے کی پیداوار رپورٹ 2018-19

تحریر: امام الدین

چیلنج کے پچھلے کئی شماروں میں ہم نے پاکستان کے چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو گندم اور کپاس کی پیداوار میں درپیش مسائل پر تحقیق پیش کی ہے۔ اس دفعہ پاکستان کسان مزدور تحریک (پی کے ایم ٹی) کی جانب سے ملک میں پہلی بار تین صوبوں پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخوا میں گنے کی فصل پر ایک تحقیق کی گئی جس کی معلومات مندرجہ ذیل ہیں:

گنا پاکستان کی اہم نقدآور فصل ہے۔ گنے سے چینی، گڑ، نباتاتی ایندھن اور چینی بننے کے بعد بچے ہوئے مواد یعنی پھوک سے گتا اور کاغذ تیار کیا جاتا ہے۔[1] زیر کاشت رقبے اور پیداوار کے حوالے سے پاکستان گنا پیدا کرنے والا دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے جبکہ فی ایکڑ پیداوار کے حوالے سے 53 ویں نمبر پر ہے۔[2] گنا 12 ماہ سے زیادہ کی فصل ہے۔ جس کی زیادہ تر پیداوار پنجاب اور سندھ سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خیبر پختونخوا میں بھی گنا پیدا ہوتا ہے۔ پاکستان کا کل زرعی رقبہ 66,788,800 (تقریباً 6 کروڑ 67 لاکھ) ایکڑ ہے[3] جس میں گنے کا زیر کاشت رقبہ 3,313,500 (تقریباً 33 لاکھ) ایکڑ ہے۔ سال 2017-18 میں گنے کی کل پیداوار 83,289,340 (تقریباً 8 کروڑ 32 لاکھ) ٹن تھی۔ جس میں پنجاب سے 55,067,490 (تقریباً 5 کروڑ 50 لاکھ) ٹن، سندھ سے 20,611,878 (تقریباً 2 کروڑ 6 لاکھ) ٹن اور خیبر پختونخوا سے 7,609,972 (تقریباً 76 لاکھ) ٹن پیداوار ہوئی جبکہ بلوچستان سے 2014 سے لے کر 2018 تک گنے کی پیداوار کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے۔[4] سال 2018-19 کے لیے تقریباً 27 لاکھ 55 ہزار (1,115.27 ہیکٹر) ایکڑ رقبے پر گنے کی کاشت سے 68,250,000 (تقریباً 6 کروڑ 82 لاکھ) ٹن پیداوار کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔[5] اس سال تقریباً 27 لاکھ 22 ہزار ایکڑ رقبے سے گنے کی کل پیداوار 67,174,000 (تقریباً 6 کروڑ 71 لاکھ) ٹن ہوئی۔ جو پچھلے سال کے مقابلے 16,159,000 (تقریباً ایک کروڑ 61 لاکھ) ٹن کم ہوئی۔[6]

پچھلے کئی سالوں سے گنے کی فصل پر تنازع سامنے آ رہا ہے۔ گنے کی قیمت فروخت پر بڑے اور چھوٹے کسان دونوں ہی مسائل سے دوچار ہیں۔ ان حالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے پی کے ایم ٹی نے چھوٹے اور بے زمین کسانوں سے سال 2018-19 کے لیے پنجاب، سندھ اور خیبر پختونخوا میں گنے کی پیداواری لاگت اور آمدنی پر معلومات اکٹھی کیں۔ اس تحقیق کے لیے دو طرح کے تحقیقی طریقہ کار استعمال کیے گئے۔ ایک طریقہ کار میں مخصوص اعداد وشمار حاصل کرنے کے لیے سوالنامہ کے ذریعے الگ الگ کسانوں سے معلومات حاصل کی گئیں تاکہ گنے کی پیداوار پر آنے والے اخراجات کے اعداد و شمار حاصل کیے جائیں۔ دوسرے طریقہ کار میں کسانوں کے چھوٹے چھوٹے گروہوں سے کچھ مخصوص سوالات کے ذریعے معلومات حاصل کی گئیں۔ اس طریقہ کو اکثر فوکس گروپ کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

گنے کی فصل پر بنیادی طور پر دو طرح کی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ سب سے زیادہ توجہ گنے کی پیداوار پر تھی۔ دوسرا موضوع کسان کی زمینی ملکیت تھا۔ عورت مزدور پر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اطمینان بخش معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ یہ خیال رہے کہ دونوں طریقہ کار میں صرف مرد کسانوں نے حصہ لیا۔

پہلے سوال نامے میں گنے کی فی ایکڑ پیداوار پر آنے والے کل اخراجات پر تفصیلی معلومات حاصل کی گئیں جس میں زمین کی تیاری، بیج، پانی، کیمیائی کھاد، زرعی زہر، گنے کی بوائی سے لے کر کٹائی اور لوڈنگ کرنے کی کل مزدوری، گنے کی نقل وحمل (ٹرانسپورٹیشن) اور زمین کی مستاجری کی رقم شامل تھی۔ گنے پر بیماری اور کیڑوں کے حملے کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا گیا کہ کسان کیمیائی کھاد نقد حاصل کرتے ہیں یا ادھار۔ کسان کی زمینی ملکیت کے بارے میں بھی معلومات حاصل کی گئیں کے کیا اسکے پاس اپنی زمین ہے یا وہ حصہ (ہارپے / راکھی) یا پھر ٹھیکے پر زمین حاصل کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا گیا کہ وہ گنے کے ساتھ گندم یا کوئی دوسری فصل کاشت کرتے ہیں۔

اس تحقیق میں پنجاب کے تین اضلاع رحیم یار خان، بھاولپور اور مظفر گڑھ شامل جبکہ سندھ کے چار اضلاع خیر پور، گھوٹکی، ٹنڈو محمد خان اور بدین شامل تھے۔ اسی طرح خیبر پختونخوا کے تین اضلاع سے بھی معلومات حاصل کی گئیں جن میں پشاور، چارسدہ اور مردان شامل تھے۔

تینوں صوبوں میں ٹنڈو محمد خان اور بدین کے علاوہ باقی ہر ضلع سے 20 کسانوں سے سوالنامے کے ذریعے معلومات حاصل کی گئیں جبکہ ضلع ٹنڈو محمد خان سے 14 اور ضلع بدین سے 11 کسانوں سے معلومات لی گئیں

یعنی پنجاب سے کل 60 کسانوں سے، سندھ میں 65 اور خیبر پختونخوا سے 60 کسانوں سے معلومات حاصل کی گئیں۔ تینوں صوبوں کے منتخب اضلاع سے کل 185 کسانوں سے سوالنامہ پر کروایا گیا۔ ہر ضلع میں دو فوکس گروپ کے ذریعے معلومات حاصل کی گئیں لیکن سندھ کے ضلع بدین میں فوکس گروپ نہیں کیے گئے۔ مجموعی طور پر کل 18 فوکس گروپ کیے گئے۔ فوکس گروپ میں کیے گئے سوالات اینکس 1 میں پیش ہیں۔

اخراجات

پنجاب میں 60 کسانوں کے کل پیداواری اخراجات 41,800 روپے سے 207,100 روپے فی ایکڑ تک دیکھے گئے جن میں سے 16.7 فیصد کسانوں کے اخراجات 90,001 سے 100,000 روپے فی ایکڑ تھے (اینکس 2 الف)۔ پنجاب میں فی ایکڑ اوسط اخراجات 102,655 روپے دیکھے گئے۔

سندھ میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق 29.2 فیصد کسانوں نے گنے کی فصل پر 70,001 سے 80,000 روپے فی ایکڑ اخراجات کیے (اینکس 2 ب)۔ سندھ میں 65 کسانوں کے اوسط اخراجات 75,894 روپے فی ایکڑ دیکھے گئے۔

خیبر پختونخوا میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق 18.3 فیصد کسانوں نے گنے کی فصل پر 50,001 سے 60,000 روپے فی ایکڑ اخراجات کیے (اینکس 2 ج) جبکہ خیبر پختونخوا میں کسانوں کے اوسط اخراجات 56,927 روپے فی ایکڑ دیکھے گئے۔

پیداوار

پنجاب میں 200 من سے 500 من فی ایکڑ سب سے کم پیداوار بتائی گئی جوکہ 28.3 فیصد کسانوں نے حاصل کی۔ سب سے زیادہ پیداوار 901 من سے 1,200 من فی ایکڑ صرف 15 فیصد کسانوں نے حاصل کی (جدول1)۔ پنجاب میں کل کسانوں کی مجموعی پیداوار 41,270 من جبکہ اوسط پیداوار 688 من فی ایکڑ ہوئی۔

جدول 1: پنجاب میں گنا فی ایکڑ پیداوار

گنا (من فی ایکڑ)	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
200 - 500	28.3	25.0	0	3.0
501 - 700	23.3	21.7	0	1.7
701 - 900	33.3	20.0	1.7	11.7
901 - 1,200	15.0	10.0	0	5.0
کل	100	76.7	1.7	21.4

سندھ میں سب سے کم پیداوار 300 من سے 500 من فی ایکڑ بتائی گئی جوکہ 26.1 فیصد کسانوں نے حاصل کی۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ پیداوار 901 من سے 1,200 من فی ایکڑ کل 18.5 فیصد کسانوں نے حاصل کی (جدول 2)۔ سندھ میں کسانوں کی مجموعی پیداوار 46,351 من جبکہ اوسط پیداوار 713 من فی ایکڑ ہوئی۔

جدول 2: سندھ میں گنا فی ایکڑ پیداوار

گنا (من فی ایکڑ)	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
300 - 500	26.1	23.1	3.1	0
501 - 700	21.5	15.3	4.6	1.5
701 - 900	33.8	27.7	1.5	4.6
901 - 1,200	18.5	18.7	3.1	0
کل	100	83.5	10.5	6.1

خیبر پختونخوا میں 36.7 فیصد کسانوں نے گنا شوگر مل میں فروخت کیا، 56.7 فیصد کسانوں نے گنے سے گڑ تیار کیا جبکہ 6.7 فیصد نے گنا چارے کے طور پر فروخت کیا۔ خیبر پختونخوا میں زیادہ تر کسان گنے سے گڑ تیار کرتے ہیں۔ اس لیے صرف 36.7 فیصد کسانوں سے فی ایکڑ پیداوار پر معلومات حاصل ہوسکیں۔ ان میں سے 11.7 فیصد کسانوں کی پیداوار 80 من سے 300 من ہوئی (جدول 3 الف)۔ فی ایکڑ گنے کا حساب رکھنے والے کل کسانوں (36.7 فیصد) کی مجموعی پیداوار 360 من ہوئی۔ اہم نقطہ یہ ہے کہ اس گروہ میں سے کوئی بھی کسان زمین کا مالک نہیں تھا۔ 56.7 فیصد کسانوں سے فی ایکڑ حاصل ہونے والی گڑ کی بوریوں کی معلومات حاصل کی گئیں۔ جس کے

مطابق ایک بوری میں تقریباً 80 کلوگرام (دومن) گڑ ہوتا ہے۔ گنے سے گڑ حاصل کر نے والے 30 فیصد کسانوں نے فی ایکڑ 13 سے 20 بوری گڑ حاصل کیا (جدول 3 ب)۔ اس گروہ کے تمام 56.7 فیصد کسانوں کو کل 764 گڑ کی بوریاں حاصل ہوئیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا 6.7 فیصد کسانوں نے گنے کی کھڑی فصل جانوروں کے چارے کے لیے فروخت کر دی۔ اس 6.7 فیصد کسانوں کے گروہ نے 75,000 سے 150,000 روپے میں گنا فروخت کیا اور انہیں اس کی مقدار کا علم نہیں تھا۔

جدول 3 (الف): خیبرپختونخوا میں گنا فی ایکڑ پیداوار

گنا فی ایکڑ من	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
80 - 300	11.7	-	6.7	5.0
301 - 500	25.0	-	21.7	3.3

جدول 3 (ب): خیبرپختونخوا میں فی ایکڑ سے گڑ کی بوریاں

گڑ (ایک بوری 80 کلو)	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
13 - 20	30	11.6	0	18.3
21 - 25	11.7	6.6	1.6	3
26 - 30	10.0	1.7	1.7	6.6
31 - 35	3.3	0	0	3.3
36 - 50	1.7	0	1.7	0
75,000 - 150,000 گنا چارے کے طور	6.7	1.7	5.0	0
کل	100	21.6	38.5	39.8

جدول 4: صوبوں میں اوسط اخراجات اور پیداوار کا تناسب

صوبہ	اوسط اخراجات (روپے)	اوسط پیداوار (من فی ایکڑ)
پنجاب	102,655	688
سندھ	75,894	713
خیبرپختونخوا	56,927	360

پنجاب میں 21.7 فیصد کسان ٹھیکہ پر زمین حاصل کرتے تھے اس لیے یہ خیال ہے کہ ان کسانوں کے سندھ اور خیبرپختونخوا کے مقابلے میں گنے کے پیداواری اوسط اخراجات زیادہ ہیں جبکہ پنجاب کی پیداوار سندھ سے کم تھی (جدول 4)۔

آمدنی

پنجاب میں 68.5 فیصد کسانوں کو گنے کی فصل سے 1,500 روپے سے 116,600 روپے تک کی حد میں آمدنی حاصل ہوئی (اینکس 3 الف)۔ سندھ میں 80 فیصد کسان فائدے میں جبکہ باقی 19.8 فیصد خسارے میں رہے (اینکس 3 ب)۔ خیبرپختونخوا میں 85 فیصد کسانوں کو گنے کی فصل سے فائدہ حاصل ہوا جبکہ 15 فیصد کسان نقصان میں رہے (اینکس 3 ج)۔

پنجاب (68.5 فیصد)، سندھ (80 فیصد) اور خیبرپختونخوا (85.2 فیصد) کے فائدے میں رہنے والے کسانوں کی مجموعی آمدنی بالترتیب 44,409 روپے، 55,551 روپے اور 32,257 روپے تھی۔

زمین

پنجاب میں ٹھیکہ پر زمین حاصل کرنے والے کسانوں میں زیادہ تر کسان ایک ایکڑ سے سات ایکڑ زمین ٹھیکے پر حاصل کرتے ہیں۔ صرف تین کسانوں نے 12 سے 16 ایکڑ زمین ٹھیکہ پر حاصل کی تھی۔ کسانوں کے مطابق ایک ایکڑ کی مستاجری 10,000 سے 80,000 روپے فی ایکڑ زمین کے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔

سندھ میں ٹھیکہ پر زمین حاصل کرنے والے کسانوں کے مطابق وہ ایک ایکڑ سے چھ ایکڑ تک زمین ٹھیکہ پر حاصل کرتے ہیں۔ ایک ایکڑ کی مستاجری 30,000 سے 50,000 روپے زمین کے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔

خیبرپختونخوا میں ٹھیکہ پر زمین حاصل کرنے والے کسانوں کے مطابق وہ ایک ایکڑ سے 20 ایکڑ تک زمین حاصل کرتے ہیں جس کی مستاجری فی ایکڑ 10,000 سے 54,000 روپے فی ایکڑ زمین کے معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ زمین کی مستاجری کی ادائیگی کسان گندم، چاول اور مکئی کی شکل میں بھی کرتے تھے۔ گنے کی فصل پر حاصل کردہ معلومات سے واضح ہوتا ہے کہ خیبرپختونخوا میں بے زمینی باقی صوبوں سے بہت زیادہ ہے۔ جیسا کہ جدول 5 سے واضح ہے۔

جدول 5: صوبوں میں گنے کی فصل کے لیے زمین رکھنے والے کسانوں کا تناسب

صوبہ	اپنی زمین (فیصد)	حصہ پر (فیصد)	ٹھیکہ پر (فیصد)
پنجاب	76.6	1.7	21.7
سندھ	81	12.1	6.0
خیبر پختونخوا	21.6	38.5	40.1

بیج

گنا کاشت کرنے کے لیے سب سے پہلا مرحلہ زمین کی تیاری کا ہوتا ہے جس میں کسان زمین کو ہل دے کر زمین ہموار کرتے ہیں۔ زمین کی تیاری کے بعد دوسرا مرحلہ بیج کی بوائی کا ہوتا ہے۔ گنے کا ایک بیج عام طور پر دو سے تین سال تک استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایک دفعہ بیج لگانے کے بعد ہر سال بیج لگانا نہیں پڑتا۔ دو سے تین سال کے بعد پرانے بیج کو نکال کر نیا بیج کاشت کیا جاتا ہے۔

تینوں صوبوں کے کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق پنجاب میں ایک ایکڑ پر 60 سے 100 من تک، سندھ میں 45 سے 100 من اور خیبر پختونخوا میں 40 سے 80 من تک گنے کا بیج لگایا جاتا ہے۔ بیج کی مقدار کا تعین زمین کے معیار کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ زمین کی تیاری اور بیج کے اخراجات صرف پہلے سال کرنے پڑتے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے سال پانی، گوڈی، کیمیائی کھاد، زرعی زہر، کٹائی اور ٹرک / ٹرالی پر گنا چڑھانے کے اخراجات کرنے ہوتے ہیں۔

پنجاب میں 81.6 فیصد کسان گنے کی بوائی جنوری سے مارچ میں کرتے تھے جبکہ پانچ فیصد کسان اپریل سے مئی اور 13 فیصد کسان اکتوبر سے دسمبر میں کرتے تھے۔ پنجاب کے 23.3 فیصد کسان گنے کا بیج صرف ایک سال ہی استعمال کرتے تھے۔ 35 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کا بیج دو سال تک، 28 فیصد کسانوں کے مطابق تین سال تک، 13.0 فیصد کسان چار سال سے چھ سال تک ایک ہی بیج استعمال کرتے تھے۔

پنجاب کے 18.3 فیصد کسانوں کے مطابق وہ گنے کا نیا بیج لگانے کے ساتھ گندم بھی کاشت کرتے تھے۔ 18.3 فیصد کسان ٹماٹر، 10 فیصد کسان سورج مکھی جبکہ 53.3 فیصد کسان گنے کے ساتھ کوئی دوسری فصل کاشت نہیں کرتے تھے۔

سندھ میں 50.8 فیصد کسان گنے کی بوائی جنوری سے مارچ کے درمیان کرتے تھے۔ 9.2 فیصد کسان اپریل سے مئی اور 40 فیصد کسان ستمبر سے دسمبر کے درمیان بوائی کرتے تھے۔

سندھ میں 15.3 فیصد کسان گنے کا بیج ایک سال تک، 33.9 فیصد کسان دو سال تک، 6.1 فیصد کسان تین سال تک جبکہ 4.7 فیصد کسان گنے کا بیج چار سال تک استعمال کرتے تھے۔ سندھ میں 26.1 فیصد کسان گنے کے ساتھ گندم کاشت کرتے تھے جبکہ 73.8 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کے ساتھ دوسری فصل کاشت نہیں کرتے تھے۔

خیبر پختونخوا میں 73.3 فیصد کسانوں کے مطابق وہ گنے کی بوائی جنوری سے مارچ میں کرتے تھے جبکہ 26.7 فیصد کسان ستمبر سے دسمبر میں بوائی کرتے تھے۔

خیبر پختونخوا میں 85 فیصد کسان گنے کا ایک بیج دو سال تک استعمال کرتے تھے جبکہ صرف 15 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کا ایک بیج تین سال تک استعمال کرتے تھے۔ خیبر پختونخوا میں 93.3 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کے ساتھ گندم بھی کاشت کرتے تھے جبکہ صرف 6.7 فیصد کسانوں نے بتایا کہ گنے کے ساتھ دوسری فصل کاشت نہیں کرتے تھے۔ یاد رہے کہ گنے کے ساتھ گندم اور دیگر فصلوں کی پیداوار پیش کردہ تحقیق میں شامل نہیں ہے۔

پانی

بیج کی بوائی کے بعد تیسرا مرحلہ پانی کا ہوتا ہے۔ گنے کی فصل کو دوسری فصلوں کے مقابلے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پنجاب کے 30 فیصد کسانوں کے مطابق فی ایکڑ سال بھر میں 15 سے 20 دفعہ پانی دیا جاتا ہے۔ 33.3 فیصد کسانوں کے مطابق 21 سے 25 دفعہ پانی اور 21.7 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کی فصل پر 26 سے 30 دفعہ پانی دیا جاتا ہے۔

پنجاب میں 23.3 فیصد کسانوں کے مطابق ان کے علاقے میں پورا سال نہری پانی نہیں آتا جس کی وجہ سے کسان پورا سال ٹیوب ویل سے کھیتی باڑی کرتے ہیں، 1.6 فیصد کسانوں کے مطابق انہیں ٹیوب ویل کے پانی کی ضرورت نہیں پڑتی باقی 75 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کی فصل کے لیے وہ نہری پانی اور ٹیوب ویل دونوں کا استعمال کرتے ہیں۔ جس میں صرف 3.3 فیصد کسان سال میں ایک ماہ ٹیوب ویل سے پانی دیتے رہے

باقی 26.7 فیصد کسان پانچ سے چھ ماہ، 30 فیصد کسان سات سے آٹھ ماہ اور 15 فیصد کسان نو سے 10 ماہ سے ٹیوب ویل کا استعمال کررہے تھے۔ پنجاب کے ہر ضلع میں کسانوں کے مطابق کم نہری پانی نے گنے کی فصل پر شدید منفی اثرات مرتب کیے۔

پنجاب کے 98.8 فیصد اور سندھ کے 92.3 فیصد کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق پانی کی عدم فراہمی کی وجہ سے کسانوں نے ٹیوب ویل سے پانی دیا جس کے نتیجے میں دونوں صوبوں میں اخراجات میں مزید اضافہ دیکھنے میں آیا۔

سندھ میں 20 فیصد کسانوں کے پاس نہر کا پانی نہیں آتا۔ کسان پورا سال ٹیوب ویل کے پانی سے کھیتی باڑی کرتے تھے، 3.0 فیصد کسانوں کے مطابق انہیں ٹیوب ویل استعمال کرنے کی ضرورت نہ پڑی باقی 77 فیصد نے نہر کے پانی کے ساتھ ساتھ ٹیوب ویل کا پانی بھی استعمال کیا۔ ان کسانوں میں سے 35.4 فیصد کے مطابق سال بھر صرف ایک سے دو ماہ نہری پانی موجود ہوتا ہے اس لیے ٹیوب ویل سے پانی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ 6.1 فیصد تین سے چار ماہ، 15.3 فیصد کسان پانچ سے چھ ماہ اور 21.5 فیصد کسان سات سے نو ماہ ٹیوب ویل کا پانی استعمال کرتے ہیں۔

سندھ کے ضلع گھوٹکی، ضلع خیر پور میرس اور ضلع ٹنڈو محمد خان میں فوکس گروپ میں معلومات دیتے ہوئے کسانوں نے کہا کہ نہر کے پانی کا مسئلہ تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے گنے کی فصل پر اخراجات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ضلع گھوٹکی کے ایک گاؤں میں کسانوں نے کہا کہ نہر کا پانی نہ ہونے کی وجہ سے گنے کی فصل پر سرکاری ٹیوب ویل سے پانی دیتے ہیں جو بجلی پر چلتا ہے۔ فی ایکڑ پر سرکاری ٹیوب ویل سے ایک پانی کا خرچ 600 روپے ہوجاتا ہے۔

پنجاب کے 31.7 فیصد اور سندھ کے 20 فیصد کسانوں نے گنے کی فصل میں صرف پانی پر 10,001 روپے سے 20,000 روپے فی ایکڑ خرچ کیا (جدول 6)۔

خیبر پختونخوا میں کیونکہ زیادہ تر کسان نہری پانی حاصل کرپاتے ہیں اس لیے ان کا موازنہ پنجاب اور سندھ کے کسانوں سے نہیں کیا جارہا۔ یہ نوٹ کرنا ضروری ہے گوکہ مجموعی پیداواری اخراجات میں پانی کا خرچہ شامل کیا گیا تھا لیکن یہاں پر اس مد میں اخراجات کو الگ سے بھی پیش کیا جارہا ہے (جدول6)۔

جدول 6: پنجاب اور سندھ میں فی ایکڑ پانی کے اخراجات

پنجاب پانی کے اخراجات (روپے)	کسان فیصد	سندھ پانی کے اخراجات (روپے)	کسان فیصد
0 - 0	1.6	0 - 0	7.7
1,400 - 10,000	28.3	1,200 - 10,000	58.5
10,001 - 20,000	31.7	10,001 - 20,000	20.0
20,001 - 30,000	21.7	20,001 - 30,000	6.1
30,001 - 40,000	10.0	30,001 - 40,000	3.0
40,001 - 60,000	6.7	40,001 - 54,000	4.6

خیبر پختونخوا میں 98.3 فیصد کسانوں کے مطابق ٹیوب ویل سے پانی لگانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ صرف 1.6 فیصد کسانوں کے مطابق انہوں نے گنے کی فصل پر ٹیوب ویل اور نہری پانی دنوں کا استعمال کیا۔ خیبر پختونخوا میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق صوبے بھر میں تقریباً 12 ماہ کسان نہر کے پانی سے گنا کاشت کرتے ہیں۔

خیبر پختونخوا کے ضلع پشاور میں کسانوں نے فوکس گروپ میں معلومات دیتے ہوئے کہا کہ نہری پانی کا کوئی مسئلہ نہیں جبکہ ضلع چار سدہ کے ایک گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ انہیں صرف گرمی کی موسم میں پانی کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ ان کے علاقے میں گرمی کے موسم میں نہر کا پانی ایک ہفتہ آتا ہے تو ایک ہفتہ نہیں آتا۔ کسانوں نے مزید یہ بھی بتایا کہ ان کے علاقے میں جاگیردار اور با اثر لوگوں کا اثر و رسوخ ہے جس کی وجہ سے ان کا نہر پر قبضہ ہے۔ جاگیرداروں کے پاس 500 سے 600 ایکڑ زرعی زمین ہے۔ ضلع مردان کے ایک گاؤں میں کسانوں نے بتایا کہ ان کے علاقے میں صرف جنوری میں نہری پانی نہیں آتا باقی پورا سال نہری پانی موجود ہوتا ہے۔ پانی کے مسئلے کے ساتھ ساتھ تینوں صوبوں کے کسانوں کا کہنا تھا کہ گنا لگانے میں حکومت کی طرف سے کسی بھی قسم کی کوئی امداد یا مدد فراہم نہیں کی جاتی۔

کیمیائی کھاد

گنے کی فصل میں کیمیائی کھاد جس میں یوریا، ڈی اے پی، گوارا، زنک، پوٹاش، سلفر، نائیٹرو فاسٹ 23-23، دانے دار، ریجنٹ، کلوری اور گیلن عام طور پر بیج

لگانے کے بعد زمین میں شامل کیا جاتا ہے یا پھر زمین کی تیاری کے وقت بھی ڈالی جاتی ہیں۔ یاد رہے کہ کیمیائی کھاد کے تمام تر اخراجات مجموعی اخراجات میں شامل ہیں۔ کسانوں سے کھاد نقد اور ادھار پر لیے جانے کی معلومات بھی حاصل کی گئیں (جدول 7 الف)۔

پنجاب میں ادھار پر کھاد حاصل کرنے والے کسانوں کے مطابق یوریا کی ایک بوری نقد کے مقابلے میں تقریباً 500 سے 1,000 روپے جبکہ ڈی اے پی کی ایک بوری 1,000 سے 1,500 روپے مہنگی پڑتی ہے۔

سندھ میں ادھار پر کھاد حاصل کرنے والے کسان یوریا کی ایک بوری پر 500 سے 1,200 روپے قیمت سے زیادہ پر خریدتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈی اے پی کی ایک بوری 500 سے 3,000 روپے نقد قیمت سے زیادہ پر حاصل کرتے ہیں۔ کسانوں نے یہ درج کروایا کہ اگر پیسے جلدی نہ دیئے جائیں تو قرضہ بڑھتا جاتا ہے۔

خیبرپختونخوا میں ادھار پر کھاد حاصل کرنے والے کسانوں کے مطابق یوریا کی ایک بوری پر 200 سے 700 روپے قیمت سے زیادہ دینے پڑتے تھے اور ڈی اے پی کی ایک بوری پر 300 سے 800 روپے قیمت سے زیادہ دینے پڑتے تھے۔

جدول 7 (الف): صوبوں میں کیمیائی کھاد خریدنے کا تناسب

صوبہ	کیمیائی کھاد نقد (کسان فیصد)	کیمیائی کھاد ادھار (کسان فیصد)	کیمیائی کھاد نقد اور ادھار دونوں (کسان فیصد)
پنجاب	55.0	15.0	30.0
سندھ	46.1	38.6	15.3
خیبرپختونخوا	76.7	20.0	3.3

جدول 7 (ب): صوبوں میں کیمیائی کھاد کے اخراجات کا تناسب

صوبہ	یوریا (روپے)	ڈی اے پی (روپے)	دیگر کھاد (روپے)	کل اخراجات (روپے)
پنجاب	400,100	433,670	181,000	1,014,770
سندھ	468,750	483,590	136,620	1,088,960
خیبرپختونخوا	266,100	311,045	158,600	735,745

تینوں صوبوں میں کیمیائی کھاد پر کل اخراجات پیش کیے جارہے ہیں جس میں پنجاب کے کسانوں نے یوریا پر کل 400,100 روپے، ڈی اے پی پر 433,670 روپے اور دیگر کھادیں جس میں زنک، پوٹاش، نائیٹرو فاسٹ، گوارا، لمڈا، کلوری، سلفر، اور گیلن شامل ہیں پر 181,000 روپے خرچ کیے (جدول 7 ب)۔

فصل پر لگنے والی بیماری

گنے کی فصل پر لگنے والے کیڑوں اور بیماریوں پر حاصل کردہ معلومات کچھ اس طرح سے ہیں۔ پنجاب کے 96.7 فیصد اور سندھ کے 84.6 فیصد کسانوں کے مطابق گنے کی فصل پر سب سے زیادہ فنگس یعنی پھپھوندی، سبز تیلا، کالا تیلا، رتا، گھوڑا مکھی، ملی بگ اور سفید مکھی کیڑوں کا حملہ ہوا تھا۔ پنجاب میں صرف 3.3 فیصد کسانوں نے اور سندھ میں 15.4 فیصد کسانوں نے فصل پر بیماری نہ ہونے کی معلومات دیں۔

خیبرپختونخوا میں 73.3 فیصد کسانوں کے مطابق سب سے زیادہ ملکھ کیڑا، سرخ کیڑا، سفید کیڑا، پیری اور پتہ کاٹنے والی بیماریوں کا حملہ ہوا تھا۔ پتے کاٹنے والے کیڑے کا نام کسانوں کو معلوم نہیں تھا۔ باقی 26.6 فیصد کسانوں نے گنے کی فصل پر بیماریاں نہ ہونے کی معلومات فراہم کیں۔

گنے کی فروخت

تینوں صوبوں میں فوکس گروپ کے ذریعے کسانوں سے گنا فروخت کرنے، گنے سے حاصل ہونے والی رقم کی ادائیگی اور زمین سے لے کر فیکٹری تک گنا لے جانے کے مسائل پر مندرجہ ذیل معلومات حاصل کی گئیں۔

پنجاب کے تینوں اضلاع رحیم یار خان، بھاولپور اور مظفر گڑ میں تقریباً تمام کسان گنا شوگر مل میں فروخت کرتے تھے۔ کسانوں کے مطابق گنے کی سرکاری قیمت 182 روپے فی من تھی جبکہ کچھ شوگر ملیں 170 روپے فی من پر گنا خرید رہی تھیں جن میں اشرف شوگر مل بھاولپور شوگر مل اور حاجرہ شوگر مل ضلع مظفر گڑھ شامل تھیں۔

پنجاب میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کھیت سے شوگر مل تک گنا فروخت ہونے میں دو سے تین دن لگ جاتے تھے۔ کھیت سے فیکٹری تک گنا لے جانے کے لیے ٹرک / ٹرالی والے 20 سے 25 روپے فی

من کرایا وصول کرتے تھے۔ کچھ علاقوں میں گنا بیل گاڑی کی مدد سے شوگر مل تک لے جاتے ہیں۔ بیل گاڑی والا گنا جلدی فروخت ہوجاتا ہے کیونکہ بیل زیادہ وقت تک کھڑے نہیں ہو سکتے۔

کسانوں نے مزید کہا کہ شوگر مل سے پیسوں کی ادائیگی تقریباً ایک سے دو ماہ میں چیک یا نقد کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔ فیکٹری تک گنا لے جانے کے دوران کسی بھی قسم کا اگر نقصان ہوجاتا ہے تو اس کا ذمہ دار بھی کسان خود ہوتا۔ چھوٹے اور بے زمین کسانوں نے یہ بھی درج کروایا کہ انہیں گنے کی فصل سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہورہا۔ ضلع بھاولپور میں کسانوں کا کہنا تھا کے پچھلے سال اشرف شوگر مل کے باہر گنے کی قیمت ادا نہ کرنے کے خلاف کسانوں نے احتجاجی مظاہرہ کیا تو شوگر مل مالکان نے کسانوں کے خلاف مقدمات درج کروا دیے۔

سندھ میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق گنے کی سرکاری قیمت 180 روپے تھی جبکہ کسانوں نے اس سے بھی کم قیمت میں گنا فروخت کیا۔ اکثر کسانوں کا کہنا تھا کہ بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے گنا فروخت کرنے کے لیے فیکٹری میں کم سے کم دو سے تین دن لگ جاتے ہیں۔ کچھ علاقوں میں چار سے پانچ دن بھی لگ جاتے ہیں۔ گنا فیکٹری لے جانے کے لیے ٹرک / ٹرالی والے فی من پر 20 سے 25 روپے لیتے تھے۔ فیکٹری سے پیسے ملنے میں ایک سے دو ماہ لگ جاتے ہیں جبکہ آڑھتی یا بروکر سے پیسے جلدی حاصل ہوجاتے ہیں۔ بروکر سرکاری نرخ سے کم قیمت پر گنا خریدتے ہیں اور پیسوں کی ادائیگی بھی جلدی کرتے ہیں تاکہ کسان زیادہ سے زیادہ گنا انہیں فروخت کریں۔

ضلع خیر پور کے ایک گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ اس سال گنا بیچنے کے شروع کے مراحل میں بڑے زمینداروں سے گنا 162 روپے فی من جبکہ چھوٹے کسانوں سے 130 روپے فی من پر خریدا گیا تھا۔ کسانوں نے یہ بھی درج کروایا کہ انہیں پچھلے سال کے گنے کے پیسے نہیں ملے۔ پچھلے سال گنا شوگر ملز تک لے جانے میں کم سے کم سات سے آٹھ دن لگ گئے تھے اور گنا فی من 95 روپے پر فروخت کیا تھا۔ ایک اور گاؤں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق گنا شوگر مل کے علاوہ بروکر کو بھی فروخت کرتے تھے۔ بروکر بھی شوگر ملز کی طرف سے ہوتا ہے جو گنے کی سرکاری قیمت سے 10 روپے کم میں گنا خریدتا ہے۔ بڑے زمینداروں کا گنا شوگر مل میں جلدی فروخت ہوجاتا ہے اور چھوٹے کسانوں کو گنا فروخت کرنے میں زیادہ دن لگ جاتے ہیں۔

ضلع گھوٹکی کے ایک گاؤں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق گزشتہ سال کسان گنا فروخت کرنے کے لیے اتنے مجبور تھے کہ کسانوں نے شوگر ملوں کو گنا آدھی قیمت پر بھی فروخت کیا تھا۔ ایک اور گاؤں کے کسانوں کے مطابق گنا شوگر ملوں کے علاوہ گنے سے جوس بنانے والوں کو بھی فروخت کرتے تھے۔ کسانوں نے یہ بھی درج کروایا کے شوگر مل سے پیسے بینک اکاؤنٹ میں آجاتے ہیں۔

ٹنڈو محمد خان کے کسانوں کے مطابق ضلع میں زیادہ تر چھوٹے کسان گنا بروکر کو دیتے ہیں۔ کسانوں کو پچھلے سال کی رقم شوگر ملوں سے ابھی تک نہیں ملی۔ کسانوں کا کہنا تھا کے شوگر مل میں گنا 120 سے 130 روپے میں فروخت کیا گیا تھا جبکہ بروکر 110 روپے فی من قیمت پر گنا حاصل کر رہے تھے۔ ایک اور گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ گنے کی سرکاری قیمت 180 روپے ہے جبکہ بروکر 10 روپے فی من کم پر گنا حاصل کرتا ہے۔ اگر گنا شوگر مل میں فروخت کرتے ہیں تو اس کے پیسے جلدی نہیں ملتے۔ بینک اکاؤنٹ بنانے کے لیے جاتے ہیں تو بینک والے زمین کے کاغذات مانگتے ہیں۔

خیبر پختونخوا میں کسانوں سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق ضلع پشاور اور مردان کے کچھ علاقوں میں کسان گنا فیکٹری میں فروخت کرتے تھے۔ باقی ضلع چار سدہ اور ضلع مردان میں زیادہ تر کسان شوگر مل میں فروخت کرنے کے بجائے گنے سے گڑ تیار کرتے تھے۔ کسانوں کا کہنا تھا کے گڑ بنانے سے انہیں اچھی آمدنی حاصل ہوتی ہے۔

ضلع پشاور کے ایک گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ زمین سے لے کر فیکٹری تک گنا لے جانے کے لیے ٹرک / ٹرالی والے 25 سے 30 روپے فی من کرایا لیتے ہیں۔ فیکٹری سے رقم ملنے سے پہلے مزدوروں کو اجرت نقد دیتے ہیں۔ فیکٹری سے گنے کی رقم زمین مالک کو حاصل ہوتی ہے کیوں کہ یہاں پر تمام کسان حصہ پر کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ کسانوں نے یہ بھی بتایا کہ شوگر مل میں گنا فروخت کرنے سے زیادہ فائدہ انہیں گنے کو بطور چارہ فروخت کرنے پر ہوتا ہے لیکن زمین مالکان ایسا کرنے نہیں دیتے کیونکہ شوگر مل سے ملنے والی رقم زمین مالک کے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتی ہے۔ زمین مالکان اپنی مرضی سے کسانوں کو پیسے دیتے ہیں۔

ضلع مردان کے ایک گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا چارے کے طور پر مال مویشی کے لیے گنے کی فصل بیچنے سے انہیں زیادہ فائدہ حاصل ہوتا

ہے اور اس کے پیسے بھی جلدی حاصل ہوجاتے ہیں۔ کسان زیادہ تر گنے سے گڑ تیار کرتے ہیں۔ گڑ کی ایک بوری 4,500 سے 5,000 روپے پر فروخت ہوجاتی ہے۔ ایک بوری کا وزن تقریباً 80 کلوگرام ہوتا ہے۔ ایک ایکڑ زمین سے گڑ کی اوسط پیداوار تقریباً 22 بوری ہوجاتی ہے۔ اگر بوری کا حساب لگایا جائے تو کسانوں کی فی ایکڑ آمدنی 99,000 سے 110,000 روپے ہے۔ ایک اور گاؤں کے کسانوں کے مطابق ان کے علاقے میں کچھ کسان بروکر کو گنا فروخت کرتے تھے۔

ضلع چارسدہ کے دو گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ گڑ بنانے میں چھوٹے کسان کو زیادہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ گڑ کی بوری اگر جلدی فروخت ہوجاتی ہے تو گھاڑیں (جس میں گڑ تیار کیا جاتا ہے) کی رقم ادا کرتے ہیں۔ اگر فصل اچھی نہ ہوئی تو چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

گنے کی کاشت پر دیگر معلومات

تینوں صوبوں کے کسانوں سے گنے کی کاشت سے گندم یا دوسری فصلوں پر پڑنے والے اثرات کے حوالے سے معلومات حاصل کی گئیں۔ پنجاب کے ضلع رحیم یار خان کے ایک گاؤں میں کسانوں نے بتایا کے بارشوں کی وجہ سے کپاس کی فصل متاثر ہوجاتی ہے۔ اس لیے گنا کاشت کرتے ہیں۔ لیکن اب پانی کی کمی کی وجہ سے اس سال ضلع میں گنے کی کاشت میں 85 فیصد کمی ہوئی ہے۔ ایک اور گاؤں میں فوکس گروپ میں کسانوں نے بتایا کہ ضلع رحیم یار خان میں خاص طور پر کپاس کاشت ہوتی تھی لیکن 12 سال پہلے کپاس کی فصل میں ایک خطرناک وائرس (بیماری) آیا جس کی وجہ سے کپاس کی فصل ختم ہوگئی تھی۔ اس لیے اب کسان کپاس سے زیادہ توجہ گنے پر دیتے ہیں۔ ضلع رحیم یار خان کے دونوں فوکس گروپ میں کسانوں نے بتایا کہ انہیں شوگرمل سے پیسے اکٹھے مل جاتے ہیں اس لیے گنا کاشت کرتے ہیں۔

ضلع بہاولپور کے تین گاؤں اور ضلع مظفرگڑ کے دو گاؤں کے کسانوں کا کہنا تھا کے گنا صرف زیادہ آمدنی کے لیے کاشت کیا جاتا ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ شوگرمل سے پیسے ایک ساتھ مل جاتے ہیں۔ پنجاب کے تینوں اضلاع میں فوکس گروپ میں کسانوں کا کہنا تھا کہ گنے کی زیادہ کاشت کی وجہ سے گندم کی فصل میں کمی ہوئی ہے کیونکہ جس زمین پر گندم کاشت ہوتا تھا اب اس پر گنا کاشت ہورہا ہے جس کی وجہ سے بھوسہ فی من 700 روپے ہوگیا ہے جو پہلے 250 روپے سے 350 روپے فی من تھا۔

صوبہ سندھ کے ضلع گھوٹکی کے دو گاؤں میں کسانوں کا کہنا تھا کہ دوسری فصلیں بارشوں کی وجہ سے متاثر ہوتی ہیں جبکہ گنے میں زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے گنے کی فصل کو بارش سے نقصان نہیں ہوتا۔ ضلع خیرپور کے دو فوکس گروپ میں کسانوں نے بتایا کہ دوسری فصلوں پر سال میں دو بار خرچہ کرنا پڑتا ہے اور گنے کی فصل میں صرف پہلے سال زیادہ خرچہ کرنا پڑتا ہے۔

گنا زیادہ اور گندم کم کاشت کرنے سے خوراک میں کمی ہورہی ہے۔ بھوسہ بھی مہنگا ہو جاتا ہے۔ اپنی زمین ہونے کے باوجود زیادہ تر کسان آٹا منڈی سے لے کر آتے ہیں۔ منڈی والے آٹے کی روٹی سخت ہوتی ہے۔ کسانوں نے یہ بھی بتایا کے ان کے علاقے میں تقریباً 90 فیصد زرعی زمین گنا لگانے سے سیم زدہ ہوگئی ہے جس کی وجہ سے کسان گندم اور دوسری فصلوں کی اچھی پیداوار حاصل نہیں کرپاتے۔

ضلع ٹنڈو محمد خان کے دو فوکس گروپ میں کسانوں کا کہنا تھا کہ ان کے پاس اپنی زمین نہیں ہے جس کی وجہ سے انہیں حصہ پر کھیتی باڑی کرنی پڑتی ہے اور اکثر فصل بھی زمینداروں کی مرضی کی لگائی جاتی ہے۔ زمین کے مالک صرف یوریا کھاد دیتے ہیں باقی اخراجات کسان خود کرتے تھے۔ ضلع ٹنڈو محمد خان میں کسانوں نے یہ بھی بتایا کہا کہ اگر زمین مالکان گنا لگانے پر سختی نہ کریں تو کسان زیادہ تر سبزیاں کاشت کریں گے۔

تجزیہ

آزاد تجارتی پالیسیاں اور گنے کی پیداوار

پاکستان میں آزاد تجارتی پالیسیوں کے تحت زرعی شعبہ میں اصلاحات کے عمل نے تقریباً ہر فصل کاشت کرنے والے کسانوں خصوصاً چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو متاثر کیا ہے۔ منڈی کی بنیاد پر پیداوار و استعمال اور ترسیل و فروخت کے اس شیطانی چکر نے نا صرف کسانوں کو بھوک، غربت اور قرض کے دلدل میں دھکیلا ہے، بلکہ ملکی معیشت بھی مجموعی طور پر ایسے ہی ایک کسان کی پر چھائی نظر آتی ہے۔ یقیناً زرعی معیشت رکھنے والے پاکستان جیسے ملک میں خودمختار اور خوشحال کسان ہی ایک خودمختار اور خوشحال ملک کی

ضمانت ہوتے ہیں۔

بڑھتی پیداواری لاگت اور گھٹتی ہوئی آمدنی

پیداواری لاگت میں اضافے کی بنیادی وجہ مداخل کا بڑھتا ہوا استعمال ہے۔ بیج، کیمیائی کھاد، زرعی زہر، پانی سمیت ہر ضرورت کسان منڈی سے خریدنے پر مجبور ہے جس کی قیمت پر کسانوں کا اختیار تو دور موجودہ نیولبرل نظام پیداوار و فروخت میں خود حکومت کے پاس بھی نہیں۔ اس کی ایک مثال یوریا کی قیمت ہے جس میں اضافہ گیس کی قیمت میں اضافے کی صورت ہوتا ہے اور گیس کی قیمت حکومت عالمی منڈی کے مطابق آئی ایم جیسے اداروں کی ایماء پر مقرر کرنے کی پابند ہے۔ ڈیزل کی قیمت میں اضافہ اور روپے کی قدر میں کمی کی وجہ سے درآمدی زرعی زہر کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یقیناً اس کی ذمہ دار بھی آئی ایم ایف جیسے ادارے ہی ہیں۔ کسانوں کی پیداواری لاگت میں اضافے کی وجوہات پانی کے حصول کے لیے ٹیوب ویل کا استعمال ہے جو ڈیزل یا بجلی سے چلتا ہے اور ملک میں توانائی کی قیمت اب منڈی کے اختیار میں ہے۔

ایک طرف کسان کو خوراک والی فصلوں سے محروم کیا جارہا ہے دوسری جانب گنے کی قیمت بڑھانے میں حکومت کی طرف سے کوئی بھی حکمت عملی پیش نہیں کی جارہی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مقرر کردہ قیمت بھی نہیں دی جاتی۔ پنجاب کے ضلع بھاولپور، سندھ کے ضلع خیرپور اور ضلع ٹنڈو محمد خان میں کسانوں کو شوگر ملز کی جانب سے پچھلے سال کی گنے کی قیمت ادا نہیں کی گئی۔

آڑھتیوں کا کردار

اس کے ساتھ ساتھ اس طریقہ پیداوار اور فروخت میں سرمایہ دار یہ پیداوار بطور خام مال استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیداوار کو خریدنے کے تمام تر عمل میں حکومتی مدد سرمایہ دار کے ساتھ ہے کیونکہ گنے سے چینی اور دیگر اشیاء بنانے کی صنعتیں خود حکومت اور حزب اختلاف کی بااثر سیاسی شخصیات کی ملکیت ہیں۔ گنے کی سرکاری قیمت تو مقرر کی جاتی ہے لیکن اس قیمت پر فروخت اور کسانوں کو برقت قیمت کی ادائیگی کو سرکاری سطح پر یقینی نہیں بنایا جاتا۔ تینوں صوبوں میں کسان شوگر ملوں کے اپنے ایجنٹوں اور بروکروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہیں۔

پیداوار اور زیر کاشت رقبے میں اضافہ

گنے کی پیداوار میں سال 19-2018 میں کمی آئی ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے اس کی پیداوار میں اضافہ ریکارڈ کیا جارہا تھا۔ گنے کی پیداوار اور اس کے زیر کاشت رقبے میں اضافے کے دو عوامل اہم ہیں۔ ایک یہ کہ چونکہ عالمی منڈی میں متبادل ایندھن کی طلب بڑھ رہی ہے گنے کی زیادہ سے زیادہ پیداوار ایتھنول کی پیداوار اور برآمد میں اضافے کا سبب بنتی ہے جو زیادہ تر مغربی ممالک کو برآمد کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر میں خوراک کی قیمتوں میں اضافے کی ایک وجہ گنے جیسی ایندھن پیدا کرنے والی فصلوں کی پیداوار بھی ہے۔ دوسرا یہ کہ ملک میں شوگر ملیں قومی ضرورت سے زیادہ ہیں اور ان میں کئی ملوں نے ایتھنول بنانے کی لیبارٹریاں بھی قائم کرلی ہیں۔ ان ملوں کو منافع کے حصول اور ایتھنول کی عالمی طلب پوری کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ گنا درکار ہوتا ہے۔ دیگر وجوہات میں کپاس کے زیر کاشت رقبے میں کمی بھی ہے۔ کیونکہ گزشتہ کئی سالوں سے ناقص جینیاتی بیجوں کی وجہ سے کپاس کی پیداوار کیڑے مکوڑوں کے حملے، موسمی تبدیلی کے اثرات کی وجہ سے مسلسل کمی کا شکار ہے اور کسان خسارے سے بچنے کے لیے کپاس کی جگہ گنے کی کاشت کو ترجیح دے رہے ہیں۔ گنے کی کاشت کی جانب کسانوں کے رجحان کی ایک وجہ موسمی تبدیلی کے اثرات بھی ہیں۔ پاکستان سیلاب، بے موسم بارشوں، شدید سردی اور شدید گرمی کے بڑھتے واقعات کا شکار ہے جس سے گندم، کپاس، سبزیاں اور دیگر فصلوں کی پیداوار بری طرح متاثر ہوتی ہے اور کسان کو شدید نقصان ہوتا ہے۔ گنے کی فصل عام طور پر ان موسمی اثرات سے زیادہ متاثر نہیں ہوتی اور کسی بڑے نقصان سے محفوظ رہتے ہیں۔

آبی وسائل کا استحصال

گندم جیسی غذائی فصل میں تین سے چار پانی لگتے ہیں جس سے چھوٹے کسانوں کو سال بھر کی خوراک میسر آسکتی ہے یہاں تک کہ کپاس میں بھی 10 سے 15 بار پانی لگتا ہے جو ملکی صنعت کو رواں دواں اور اس صنعت سے وابستہ لاکھوں مزدوروں کو بیروزگاری سے بچاسکتی ہے، لیکن گنے کی پیداوار میں 20 سے 25 مرتبہ پانی لگانا پڑتا ہے۔ ملک میں پانی کی کمی کے تناظر میں اس فصل کا فروغ اور ایتھنول اور چینی کی برآمد سراسر ملکی آبی وسائل اور کسانوں کا استحصال ہے۔

بے زمینی

پیش کردہ تحقیق کے مطابق پنجاب اور سندھ میں گنے کی فی ایکڑ اوسط پیداوار میں بڑا فرق نہیں تھا لیکن پنجاب سے گنے کی اوسط آمدنی فی ایکڑ 44,409 روپے، سندھ سے 55,551 اور خیبرپختونخوا سے 32,257 روپے فی ایکڑ ہوئی۔ جسے اگر 12 ماہ میں تقسیم کیا جائے تو پنجاب، سندھ اور خیبرپختونخوا کے کسانوں کی ماہانہ آمدنی بالترتیب 3,700 روپے فی ایکڑ، 4,629 روپے اور 2,696 روپے فی ایکڑ ہوئی۔ یعنی چھوٹا کسان (جس کے پاس اپنی زمین ہے) ایک ایکڑ سے 2,696 سے 4,629 روپے سال بھر میں کما پاتا ہے جبکہ پیداواری لاگت میں کسان کی سال بھر کی انتھک محنت کا معاوضہ شامل نہیں کیا جاتا۔ یہ خیال رہے کہ خیبرپختونخوا میں 38.5 فیصد کسان حصہ پر کاشت کر رہے ہیں۔ اس لیے خیبرپختونخوا میں حصہ پر کسانوں کی ماہانہ آمدنی 1,300 روپے بنتی ہے۔ اگر آمدنی پر مزید غور کریں تو صاف ظاہر ہے کہ خیبرپختونخوا کے کسان جو کہ شوگر ملوں کو گنا فروخت کررہے ہیں ان کی آمدنی پنجاب اور سندھ کے کسانوں سے بہت کم ہے۔

اس تحقیقی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین حصے پر لینے والے بے زمین کسان زمیندار کی خواہش پر گنا کاشت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ پیداواری اخراجات میں جب زمین کی مستاجری بھی شامل ہو جائے تو اکثر بے زمین کسانوں کو آمدنی نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ اگر کسانوں کی زمین اپنی ہوتو وہ اس پر گندم اور دیگر غذائی فصلیں کاشت کرکے کم از کم اپنی خوراک کی ضرورت پوری کرسکتے ہیں۔ بے زمینی ہی ملک بھر میں کسان مزدوروں میں غربت اور بھوک کی وجہ ہے کیونکہ تقریباً آدھی زرعی زمینیں بڑے جاگیرداروں کے قبضے میں ہیں جس کے خاتمے کے لیے لازم ہے کہ زمین کی منصفانہ اور مساویانہ تقسیم ہو۔

حوالاجات

1۔ احمد، جنید۔ ''چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا؟''۔ چیلنج جنوری تا اپریل، 2015، صفحہ 26 سے 29۔

2. Business Recorder. "Report presented to ECC: sugarcane output shows declining trend in 2018-19." Business Recorder, Nov 27th, 2018. Accessed from https://fp.brecorder.com/2018/11/20181127426642/

3۔ احمد، جنید۔ ''چینی کی صنعت کی ترقی: فائدہ کس کا؟''۔ چیلنج جنوری تا اپریل، 2015، صفحہ 26۔

4. Pakistan Sugar Mill Association. "Annual Report 2018." Pakistan Sugar Mill Association, 2018 p. 4. Accessed from http://www.psmacentre.com/documents/PSMA%20Annual%20Report%202018.pdf

5. Pakistan Agricultural Research Council. "Meeting of Federal Committee on Agriculture (FCA), performance of Kharif crops (2018-19) reviewed and production for Rabi Crops (2018-19) planned." Pakistan Agricultural Research Council, November 11, 2018. Accessed from http://www.parc.gov.pk/index.php/en/faqy/168-parc-flash-news-2018/1544-meeting-of-federal-committee-on-agriculture-fca-performance-of-kharif-crops-2018-19-reviewed-and-production-for-rabi-crops-2018-19-planned

6. Government of Pakistan, Finance Division. "Agriculture." Government of Pakistan, 2018-19, p. 17. Accessed from http://www.finance.gov.pk/survey/chapters_19/Economic_Survey_2018_19.pdf

اینکس 1

سوالات

1۔ گنا کیوں کاشت کرتے ہیں؟

2۔ کیا گنا کاشت کرنے میں حکومت مدد فراہم کرتی ہے؟

3۔ گنا کاشت کرنے کے لیے پانی کے کیا مسائل ہیں؟

4۔ گنے کی کٹائی، گنا فیکٹری تک پہنچانے اور فیکٹری سے نقد رقم کیسے حاصل ہوتی ہے؟

4۔ فیکٹری کے علاوہ گنا کسی دوسری جگہ پر بھی فروخت کرتے ہیں؟

5۔ گنا کاشت کرنے سے خوراک والی فصلوں خصوصاً گندم پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

جدول الف: پنجاب میں گنے کی فصل پر کل اخراجات

فی ایکڑ اخراجات	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
41,800 - 50,000	3.3	3.3	0	0
50,001 - 60,000	5.0	3.3	1.7	0
60,001 - 70,000	11.7	11.6	0	0
70,001 - 80,000	6.7	6.7	0	0
80,001 - 90,000	13.3	13.3	0	0
90,001 - 100,000	16.7	16.6	0	0
100,001 - 110,000	6.7	5.0	0	1.7
110,001 - 120,000	11.7	8.3	0	3.3
120,001 - 130,000	8.3	6.7	0	1.7
130,001 - 140,000	3.3	0	0	3.3
140,001 - 150,000	3.3	1.7	0	1.7
150,001 - 160,000	1.7	0	0	1.7
160,001 - 170,000	1.7	0	0	1.7
170,001 - 180,000	1.7	0	0	1.7
180,001 - 207,100	5.0	0	0	5.0
کل	100	76.5	1.7	21.8

جدول ب: سندھ میں گنے کی فصل پر کل اخراجات

فی ایکڑ اخراجات	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
47,250 - 50,000	4.6	3.0	1.5	0
50,001 - 60,000	18.5	13.9	1.5	3.0
60,001 - 70,000	15.4	10.8	3.0	1.5
70,001 - 80,000	29.2	26.1	3.0	0
80,001 - 90,000	12.3	12.3	0	0
90,001 - 100,000	4.6	3.0	0	1.5
100,001 - 110,000	7.7	7.9	0	0
110,001 - 120,000	3.0	0	1.5	1.5
120,001 - 127,500	4.6	4.7	0	0
کل	100	81.8	10.5	7.5

جدول ج: خیبر پختونخوا میں گنے کی فصل پر کل اخراجات

فی ایکڑ اخراجات	کسان فیصد	اپنی زمین پر	حصہ پر	ٹھیکہ پر
18,250 - 30,000	11.7	5.0	6.7	0
30,001 - 40,000	15.0	6.7	8.3	0
40,001 - 50,000	16.7	5.0	8.3	3.3
50,001 - 60,000	18.3	1.6	6.6	10.0
60,001 - 70,000	11.7	0	5.0	6.6
70,001 - 80,000	10.0	0	1.6	8.3
80,001 - 90,000	6.7	3.3	0	3.3
90,001 - 100,000	5.0	0	0	5.0
100,001 - 118,200	5.0	0	1.6	3.3
کل	100	21.7	38.5	40.0

جدول الف: پنجاب میں گنا فی ایکڑ آمدنی

آمدنی (فی ایکڑ روپے)	کسان فیصد	اپنی زمین	حصہ پر	ٹھیکہ پر
1,500 - 10,000	6.7	3.3	-	3.3
10,001 - 20,000	5.0	5.0	-	-
20,001 - 30,000	11.7	8.3	-	3.3
30,001 - 40,000	5.0	5.0	-	-
40,001 - 50,000	16.7	13.3	1.7	1.7
50,001 - 60,000	6.7	6.7	-	-
60,001 - 70,000	6.7	6.7	-	-
70,001 - 80,000	3.3	1.7	-	1.7
80,001 - 90,000	1.7	1.7	-	-
90,001 - 116,600	5.0	5.0	-	-
فائدہ اٹھانے والے کل کسان	68.5	56.7	1.7	10.0

نقصان اٹھانے والے کسان

1,900 - 10000	6.7	3.3	-	3.3
10,001 - 20,000	6.7	5.0	-	1.7
20,001 - 30,000	3.3	3.3	-	-
30,001 - 40,000	6.7	5.0	-	1.7
40,001 - 50,000	-	-	-	-
50,001 - 60,000	-	-	-	-
60,001 - 77,200	8.3	3.3	-	5.0
نقصان اٹھانے والے کل کسان	31.7	10.0	-	11.7

جدول ب: سندھ میں گنا فی ایکڑ آمدنی

آمدن (فی ایکڑ روپے)	کسان فیصد	اپنی زمین	حصہ پر	ٹھیکہ پر
4,450 - 10,000	7.7	3.0	4.6	-
10,001 - 20,000	3.0	1.5	1.5	-
20,001 - 30,000	12.3	10.8	1.5	-
30,001 - 40,000	4.7	3.0	1.5	-
40,001 - 50,000	9.2	7.8	-	1.5
50,001 - 60,000	7.8	6.1	-	1.5
60,001 - 70,000	10.7	9.2	1.5	-
70,001 - 80,000	6.1	6.1	-	-
80,001 - 90,000	3.0	3.0	-	-
90,001 - 100,00	7.8	6.1	-	1.5
100,001 - 110,000	1.5	1.5	-	-
110,001 - 120,000	1.5	1.5	-	-
120,001 - 131,100	4.6	4.6	-	-
فائدہ اٹھانے والے کسان	80	64.2	10.7	4.5

نقصان اٹھانے والے کسان

488 - 10000	7.7	4.6	1.5	1.5
10,001 - 20,000	6.1	6.1	-	-
20,001 - 30,000	3.0	3.0	-	-
30,001 - 40,000	1.5	1.5	-	-
40,001 - 84,500	1.5	1.5	-	-
نقصان اٹھانے والے کل کسان	19.8	16.7	1.5	1.5

جدول ج: خیبر پختونخوا میں گنا فی ایکڑ آمدنی

آمدنی (فی ایکڑ روپے)	کسان فیصد	اپنی زمین	حصہ پر	ٹھیکہ پر
2,000 - 10,000	15.0	1.6	6.7	6.7
10,001 - 20,000	21.7	-	15.0	6.7
20,001 - 30,000	11.7	-	6.7	5.0
30,001 - 40,000	10.0	5.0	1.7	3.3
40,001 - 50,000	10.0	5.0	1.7	3.3
50,001 - 60,000	1.7	1.7	-	-
60,001 - 70,000	6.7	3.3	1.7	1.7
70,001 - 80,000	1.7	1.7	-	-
80,001 - 90,000	5.0	3.3	-	1.7
90,001 - 121,900	1.7	-	-	1.7
فائدہ اٹھانے والے کسان	85.2	26.	33.5	30.1

نقصان اٹھانے والے کسان

600 - 10000	5.0	-	3.3	1.7
10,001 - 20,000	3.3	-	-	3.3
20,001 - 30,000	1.7	-	1.6	-
30,001 - 43,700	5.0	-	-	5.0
نقصان اٹھانے والے کل کسان	15.0	-	5.0	10.0

''خالص دودھ'' کی سیاست: کمپنیوں کی نئی چال!

تحریر: عذرا طلعت سعید

پچھلے کچھ سالوں سے پاکستان میں دودھ کی پیداوار، ترسیل و فروخت کے حوالے سے کئی خبریں سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً ڈان اخبار نے 15 جنوری، 2018 کو ایک خبر شائع کی جس کے مطابق پنجاب فوڈ اتھارٹی نے پنجاب کی 144 تحصیلوں کے داخلی اور خارجی مقامات پر دودھ کی جانچ پڑتال کا بندوبست کیا۔ نتیجے میں تقریباً 40,000 لیٹر دودھ کو ضبط کرکے ضائع کردیا گیا۔[1] بزنس ریکارڈر کی 6 ستمبر، 2018 کی ایک خبر کے مطابق پنجاب فوڈ اتھارٹی نے پورے صوبے میں دودھ میں ملاوٹ کے خلاف کارروائی شروع کردی۔ اس سلسلے میں 53,616 لیٹر دودھ کو جس میں پانی اور دیگر کیمیائی اشیاء کی ملاوٹ پائی گئی ضائع کردیا۔[2] 26 مئی، 2019 کی خبر کے مطابق پنجاب فوڈ اتھارٹی کی ڈیری حفاظتی ٹیم نے ملاوٹ شدہ دودھ کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے 5,000 لیٹر دودھ ضائع کردیا[3] اور اس سارے مسئلے کا حل آخر کار کو 6 ستمبر، 2019 کی ایک خبر سے سامنے آ گیا۔ پنجاب فوڈ اتھارٹی کے چیئرمین عمر تنویر نے پاکستان ڈیری ایسوسی ایشن کے ایک سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ 2022 تک تمام کھلے دودھ کی فروخت پر پابندی عائد کردی جائے گی۔[4]

سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کیوں کیا جارہا ہے؟ جس ملک میں آج تک عوام کو صاف پانی مہیا نہیں کیا گیا وہاں خالص دودھ پر اس قدر نظر کیوں ہے؟ دیکھنے میں آرہا ہے کہ حکومت، خاص کرکے حکومت پنجاب کی ناصرف دودھ بلکہ دیگر غذائی اشیاء پر بھی اس کے معیار کے حوالے سے کڑی نظر ہے۔ یہ مضمون خالص غذا کے حصول کے لیے بنائے گئے قوانین اور اس کی سیاست کو سمجھنے کی پہلی کاوش ہے۔

پاکستان میں خالص غذا کے حوالے سے قوانین و ضابطے پاکستان پیور فوڈ لاز (Pure Food Laws/PFL) 1963 میں بنائے اور لاگو کیے گئے۔ ان قوانین میں 2007 اور 2011 میں ترمیم کی گئی۔ غذائی تحفظ کے حوالے سے پاکستان میں ایک مربوط قانون نہیں ہے بلکہ کئی قوانین ہیں جو غذائی تحفظ کے مختلف پہلوؤں کو پرکھتے ہیں۔

پاکستان پیور فوڈ لاز کی بنیاد پر تجارت سے جڑی غذائی اشیاء کے لیے قانونی ڈھانچہ متعارف کروایا گیا ہے۔ مرکزی حکومت ایک بین الاقوامی ادارے کوڈیکس ایلیمینٹریس کی بنائے ہوئے معیار اور ہدایات (گائیڈ لائینز) پر عمل درآمد کرتی ہے۔ اس ادارے پر تفصیلی مضمون اگلے صفحات پر فراہم کی گئیں ہیں۔

آئین میں 18 ویں ترمیم کے بعد کئی شعبہ جات میں مرکزی حکومت کے اختیارات صوبوں کو منتقل کردیے گئے۔ صاف غذا کے لیے قانون سازی اور زراعت دونوں شعبہ جات بھی صوبوں کے پاس چلے گئے۔ اس بنیاد پر ہرصوبے نے اپنے لیے قوانین بنانے شروع کیے۔

اس طرح 2011 میں پنجاب فوڈ اتھارٹی ایکٹ وجود میں آیا۔ اس قانون کے تحت پنجاب فوڈ اتھارٹی کو دیے گئے اختیارات مندرجہ ذیل ہیں:[5]

1۔ فوڈ اتھارٹی کھانے کے کاروبار کے انتظام کی دیکھ بھال اور جانچ کرے گی تاکہ محفوظ غذا میسر ہوسکے۔

2۔ فوڈ اتھارٹی کے اختیار میں ہے کے وہ غذا کے کسی بھی پہلو پر بشمول غذا کا کاروبار، اس کے لیے لیبل، اس میں ڈالے جانے والے اجزاء (food additives) کے لیے معیار، طریقہ کار، عمل اور ہدایات (guidelines) دے سکتی ہے اور ساتھ ساتھ ان پر عمل درآمد کے لیے مناسب انتظام کی نشاندہی بھی کرسکتی ہے۔ فوڈ اتھارٹی کے اختیار میں شامل ہے کہ وہ غذائی لیبارٹری کے لیے طریقہ کار اور رہنمائی فراہم کرے تاکہ ان لیبارٹیوں کو قابل اعتبار (accredited) سمجھا جاسکے۔ اتھارٹی حکومت کو غذا کے حوالے سے سائنسی مشورے اور تکنیکی مدد فراہم کرنے کے علاوہ سائنسی اور تکنیکی مواد بھی جمع کرسکتی ہے۔ غذائی تحفظ اور معیار کے لیے تربیت فراہم کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ برآمد کی جانے والی غذا کے لیے سند بھی فراہم کرتی ہے۔

3۔ فوڈ اتھارٹی اپنے کام اور ذمہ داریوں کو جہاں تک ممکن ہوٹھوس سائنسی اصولوں اور بین الاقوامی معیار کے مطابق پورا کرے گی۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ غذا کے حوالے سے پنجاب فوڈ اتھارٹی بڑھ چڑھ کر اقدامات کررہی ہے۔ جن سائنسی اصولوں پر وہ کام کررہی ہے اس میں کوڈیکس ایلیمینٹریس ادارے کے بنائے گئے اصول وضوابط کی کچھ جھلک نظر آرہی ہے۔ مثال کے طور پر ایک خبر کے مطابق پنجاب فوڈ اتھارٹی نے

2020 تک بناسپتی گھی کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اتھارٹی کے سائیٹفک پینل نے کوڈیکس ایلیمینٹریس کے معیار کے مطابق گھی میں ایک مخصوص چربی ٹرانس فیٹی ایسڈز (trans-fatty acids) کی مقدار کو 0.5 فیصد تک لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اتھارٹی کے خیال سے پاکستان میں ہر فرد سالانہ 18 کلو گرام تیل اور گھی استعمال کرتا ہے جبکہ یورپ میں یہ شرح صرف تین کلو گرام فی کس سالانہ ہے۔ اس لیے پاکستانیوں کو سویابین تیل، سورج مکھی اور دیگر سبزیوں سے بنے تیل کی طرف راغب کرنا ہے نا کے بناسپتی گھی کی طرف۔[6]

اب عوام کے لیے یہ سوال بنتا ہے کہ حکومت کو اچانک عوام کے لیے صاف خوراک کا خیال کیوں کر آیا؟ یہاں اس حقیقت کی یاد دہانی ضروری ہے کہ نیشنل نیوٹریشن سروے 2018 کے مطابق پاکستان کے تقریباً آدھے گھرانے اپنی غذائی ضروریات پوری نہیں کر پارہے۔ دوسرے لفظوں میں 50 فیصد سے زائد گھرانے غربت کی وجہ سے دو وقت کا کھانا حاصل نہیں کر پاتے جو آبادی میں سنگین غذائی کمی کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارے ملک کے 40.2 فیصد بچے دائمی غذائی کمی اور نشو و نما میں کمی کا شکار ہیں۔ ان حالات میں حکومت عوام کے لیے انسانی ضرورت کے مطابق غذا فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کرے تو کیا وہ زیادہ ضروری نہیں؟

اب اگر ہم پیور فوڈ یعنی خالص غذا کے حوالے سے قانون سازی کو نیولبرل پالیسی سازی کی آنکھ سے دیکھیں تو شاید ان سارے عوامل کو سمجھنے میں مدد ملے۔

دنیا بھر میں نیولبرل پالیسی سازی 1990 کی دہائی میں تیز ہوئی۔ اس زمانے کو اکثر گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کے نام سے جانا جاتا ہے۔ عوام دوست گروہ اسے سامراجیت کا نام بھی دیتے ہیں۔ اس دور کا آغاز عالمی ادارہ برائے تجارت (World Trade Organization/WTO) کے انعقاد سے جوڑا جاتا ہے۔ WTO (ڈبلیو ٹی او) 1995 میں قائم ہوا اور اس نے دنیا بھر میں تجارت کے لیے نئے قوانین پیش کیے جن پر عمل درآمد ہر رکن ملک کے لیے لازمی ہے۔ پاکستان بھی اس ادارے کا رکن ہے۔

ڈبلیو ٹی او کے کئی معاہدوں میں ایک مخصوص معاہدہ جسے سینٹری اینڈ فائیٹو سینٹری میژرز (Sanitary and phytosanitary measures/SPS) کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کا بنیادی مقصد غذائی تحفظ کے لیے اقدامات اور نباتات و جانوروں کی صحت کے حوالے سے نظم و ضبط (regulations) نافذ کرنا ہے۔ SPS (ایس پی ایس) حکومتوں کو ایسے اقدامات کی ترغیب دیتا ہے جو بین الاقوامی معیار، ہدایات اور مشاورت پر مبنی ہو۔ اس عمل کو ''ہارمونائیزیشن'' کہا جاتا ہے۔[7]

اگر کسی ملک کے قوانین بین الاقوامی درجہ کے ہوں تو اس ملک کی منڈی میں کاروبار کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اسی لیے ڈبلیو ٹی او ''ہارمونائزیشن'' کو ترجیح دیتا ہے تاکہ باآسانی آزاد تجارت کو اپنایا جاسکے۔[8] ڈبلیو ٹی او کی قانونی ساخت ایسی نہیں کہ وہ ممالک کی اندرونی غذائی پالیسیوں میں تجارت کے حوالے سے تبدیلی کرسکے۔ اسی لیے ڈبلیو ٹی او کے ایس پی ایس معاہدہ نے اس مقصد کے لیے بالواسطہ بین الاقوامی ہارمونائزیشن کے لیے ڈبلیو ٹی او سے ہٹ کر دیگر اداروں کی نشاندہی کی ہے۔ ایس پی ایس اس نکتہ کو بھی اہمیت دیتا ہے کہ ممالک آپس میں ایک دوسرے کے ہاں لاگو مختلف مسابقت رکھنے والے قوانین کو تسلیم کریں۔ تیسرا اہم نقطہ یہ ہے کہ اگر کوئی ملک محفوظ غذا کے حوالے سے غذائی اشیاء کی تجارت میں قانونی رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس رکاوٹ کے لیے سائنسی بنیاد پیش کرنا ضروری ہے۔

محفوظ غذا سے کیا مراد ہے؟

فوڈ سیفٹی یا محفوظ غذا سے مراد ہے کہ غذا ہر قسم کی آلودگی، کسی بھی جراثیم یا وائرس، یا پھر کوئی زہر مثلاً نباتات میں پائے جانے والے زہر سے پاک ہو۔ محفوظ غذا صرف ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہونے کی اصطلاح نہیں بلکہ اس سے مراد غذائیت، غذا کا معیار، اس پر آویزاں لیبل اور غذا کے بارے میں معلومات اور سمجھ بوجھ سے بھی ہے۔

ڈبلیو ٹی او نے جن اداروں کے ذریعے غذائی تحفظ، جانوروں اور نباتات کی صحت کے حوالے سے نظم و ضبط، قوانین میں ہم آہنگی یا ہارمونائزیشن کے معیار کو استعمال کرنے کی نشاندہی کی ہے ان میں شامل ہیں کوڈیکس ایلیمینٹریس کمیشن (Codex Alimentarius Commission)، انٹرنیشنل آفس آف اپی زوٹیکس (International Office of Epizootics) اور انٹرنیشنل پلانٹ پروٹیکشن کنونشن (International Plant Protection Convention)۔ غذا اور محفوظ غذا کے حوالے سے معیار قائم کرنے کے لیے ایس پی ایس کوڈیکس ایلیمینٹریس کو استعمال کرتا ہے۔[9] کوڈیکس ایلیمینٹریس کا ایس پی ایس کے معاہدے میں استعمال کوڈیکس ایلیمینٹریس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتا ہے۔ ڈبلیو ٹی او کے ارکان جو یہ معیار استعمال کرتے ہیں انہیں اپنی غذائی اشیاء میں جراثیم اور کیڑے مکوڑوں کے خاتمے کے لیے کیے گئے

اقدامات کی تفصیلات دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر حکومتیں کوڈیکس کمیشن کا استعمال نہیں کرتیں تو پھر انہیں یہ ثبوت دینا ہوتا ہے کہ ان کے اقدامات سائنسی معیار کے مطابق ہیں۔[10]

معیار بنانے کے حوالے سے کوڈیکس ایلیمینٹریس پر کافی تنقید کی گئی ہے۔ کوڈیکس ایلیمینٹریس کمیشن (CAC) عالمی ادارہ برائے خوراک و زراعت (Food & Agriculture Organization/FAO) اور عالمی ادارہ برائے صحت (World Health Organization/WHO) کے ماتحت ہے اور اپنا زیادہ تر کام کمیٹیوں کے ذریعہ کرتا ہے۔ کوئی بھی کمیٹی کسی ایک ملک کی سرپرستی میں قائم کی جاتی اور کام کرتی ہے یعنی کمیٹی بنانے والا ملک کمیٹی کا سربراہ چنتا ہے۔ یہی ملک اس کمیٹی کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے یعنی جو ملک بھی کمیٹی بنائے گا اس کا اس کمیٹی پر کافی اثر و رسوخ ہوگا۔ کوڈیکس کمیشن پر سائنس کے استعمال پر بھی تنقید پائی جاتی ہے۔ اس کمیٹی کے قیام کا طریقہ کار اور سائنس کے استعمال کی جانچ پڑتال کوڈیکس کمیشن کی عملی کارروائی میں کافی مسائل کو سامنے لاتی ہے۔ ان مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے ایک مخصوص کارروائی کی معلومات یہاں پر درج کی جارہی ہیں:[11]

صنعتی ممالک میں جانوروں کو ہارمونز کے انجکشن لگائے جاتے ہیں تاکہ وہ زیادہ دودھ دیں یا پھر گائے کے گوشت میں بڑھوتری کے لیے ہارمونز استعمال ہوتے ہیں۔ ان ہارمونز کی جانوروں کے دودھ اور گوشت میں باقیات کے بارے میں تنازع رہا ہے کہ کیا یہ انسانی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں؟

کوڈیکس کمیشن نے ہارمونز کے معیار کے تعین کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی تھی جس کا نام ''کوڈیکس کمیٹی ان ریسیڈیوز آف ویٹرینری ڈرگز ان فوڈ'' (Codex Committee on Residues of Veterinary Drugs in Food / جانوروں کو دی جانے والی ادویات کی غذا میں باقیات) تھا۔ اس کمیٹی کا میزبان امریکہ تھا اور امریکی گوشت کی صنعت کا معیار طے کرنے میں سب سے زیادہ مفاد تھا۔

ہارمونز کے لیے معیار بنانے کے لیے کمیٹی امریکہ نے بنائی تھی اس لیے کمیٹی کا سیکریٹریٹ بھی اسی کے پاس تھا۔ سیکریٹریٹ کا کام ہوتا ہے کہ وہ مطلوبہ معیار کے لیے پہلے مسودہ یا ڈرافٹ بنائے۔ اس کے علاوہ جب معیار بنایا جارہا ہوتا ہے تو رکن ممالک اپنے وفد میں کسی کو بھی لاسکتے ہیں۔ امریکہ کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ اپنے وفد میں ایسے نمائندوں کو لاتے ہیں جن کا تعلق غذا کی کمپنیوں سے ہے۔ کوڈیکس کمیشن میں ہارمونز کے حوالے سے معیار نہیں بنایا جاسکا کیونکہ کچھ ارکان کا خیال تھا کہ پیش کردہ معیار صارفین کی حفاظت، احتیاطی تدابیر کی ضروریات اور اخلاقی حوالوں سے پورا نہیں اتر پارہا تھا۔ اس کی جوابی کارروائی میں یہ کہا گیا کہ ''غذائی معیار ... مضبوط سائنسی تجزیہ اور ثبوت کے اصولوں پر کھڑے کیے جائیں گے''۔[12] اس کے بعد ایسے معیار جو امریکی گوشت کی صنعت کے مفاد میں تھے منظور کرلیے گئے۔ معیار کو انتخابی عمل کے ذریعہ منظور کروایا گیا تھا۔ جس میں 33 ووٹ حمایت میں، 29 مخالفت میں تھے اور 7 نے ووٹ ڈالنے سے گریز کیا۔ یہاں پر واضح ہے کہ اگر صنعت کے نمائندے کمیٹی میں بیٹھے ہوں تو انتخابات کو کس طرح سرمایہ دار اور صنعت کے فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ امریکہ کی گوشت کی صنعت نے اپنے مفادات کو سامنے رکھتے ہوئے ہارمونز کے حوالے سے نئے معیار کوڈیکس کمیشن میں منوا لیے۔

اوپر بیان کی گئی مثال اور دیگر کئی تحقیقات نے اس رائے کو جگہ دی ہے کہ کوڈیکس کمیشن صنعت اور سرمایہ دار کے مفاد کو تحفظ دیتا ہے۔ کمیشن ایسے معیار بناتا ہے جو کہ تجارت اور زرعی و کیمیائی کمپنیوں کے مفاد کو تحفظ دیں۔[13] ایک تحریر کے مطابق 1989-1991 کے دورانیہ میں کوڈیکس کمیٹیوں میں کل 2,578 ارکان میں سے 660 افراد کا تعلق کمپنیوں سے تھا۔ اس وقت کوڈیکس کمیشن میں 105 قومی وفد شرکت کررہے تھے۔ جبکہ 140 کمپنیاں ان میں شامل تھیں۔[14] اس طرح 2010 میں کوڈیکس کے ایک اجلاس میں نیسلے کمپنی ناصرف بذات خود موجود تھی، اس کے علاوہ کئی وفود کا بھی حصہ تھی۔ کوکا کولا کمپنی کے نمائندے امریکی وفد کے ساتھ آئے ہوئے تھے جو اس کمپنی کے لیے معمول کے مطابق عمل ہے۔[15]

کمیشن کی ساخت ایسی ہے کہ اس میں حصہ لینا ایک مہنگا سودا ہے۔ کوڈیکس میں امیر صنعتی ممالک کی شمولیت اور عمل دخل واضح ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا جو ملک معیار بنوانا چاہتا ہے وہی کمیٹی کا خرچ اٹھاتا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک کے پاس وسائل کی کمی ان کے کوڈیکس کمیشن میں حصہ لینے میں رکاوٹ بنتی ہے۔[16]

اس مضمون میں بات پاکستان میں خالص غذا کے لیے نئے قوانین بنائے جانے سے شروع کی گئی تھی۔ اب اگر پاکستان خصوصاً پنجاب ''خالص غذا'' کے حوالے سے دودھ کا معیار طے کررہا ہے تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس وقت دودھ کی منڈی میں کون سے کردار کارفرماں ہیں اور یہ معیار

کس کے مفاد میں ہیں؟ ہال ہی میں اینگرو فوڈز میں 51 فیصد حصص ہالینڈ کی ایک کمپنی فرائس لینڈ کمپینا نے خرید لیے ہیں۔ اس کے علاوہ جو دوسری بڑی کمپنی پاکستان میں دودھ کی منڈی میں پیش پیش ہے وہ نیسلے ہے۔ باوجود ان کمپنیوں کی موجودگی کے یہ ایک حقیقت ہے کہ 95 فیصد کھلے دودھ کے طور پر فروخت ہورہا ہے دوسرے لفظوں میں کہہ سکتے ہیں کہ دودھ کی کمپنیاں فی الوقت صرف 5 فیصد دودھ کے کاروبار میں حصہ لے رہی ہیں۔ اس روشنی میں اگر دودھ کی منڈی میں معیار طے کیے جارہے ہیں تو اس کی سیاست سمجھنا زیادہ مشکل نہیں۔ اگر یہ 95 فیصد دودھ کو بین الاقوامی صاف غذا کے معیار پر لایا گیا تو کھلا دودھ چھوٹے کسانوں اور چھوٹے پیمانے پر دودھ کا کاروبار کرنے والوں کے ہاتھ سے نکل کر بڑی بڑی کمپنیوں کے پاس چلا جائے گا اور پھر یہ دودھ کمپنیوں کے ڈبوں میں فروخت ہوگا۔ ڈبے کا دودھ یقیناً عام لوگوں کی دسترس سے دور ہوجائے گا۔ مزید یہ کہ جب پاکستانی ڈبے کا دودھ عالمی تجارتی معیار پر پورا اترے گا تو دودھ اور اس سے بنائی گئی دیگر اشیاء مثلاً بالائی، مکھن، دہی وغیرہ باآسانی برآمد کیا جاسکے گا۔

یہ خیال ہے کہ ان دونوں ہی اثرات سے ملک میں غذائی کمی مزید سنگین ہوگی۔ دودھ کی بین الاقوامی کمپنیوں اور ان کی حکومتوں کے پاکستان میں متحرک ہونے کے شواہد ان اقدامات و واقعات سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

ایک خبر کے مطابق اینگرو فوڈز اور فرائس لینڈ کمپینا کی انتظامیہ نے گورنر ہاؤس میں سندھ کے گورنر عمران اسماعیل سے ملاقات کی ہے۔ ملاقات کا مقصد نجی اور سرکاری شراکت داری (پبلک پرائیوٹ پارٹنر شپ) سے ڈیری شعبے سے جڑے چھوٹے کسانوں کے لیے پائیدار روزگار پیدا کرنے اور پاکستانی عوام کو محفوظ ڈیری مصنوعات کی فراہمی پر بات چیت کرنا تھا۔ اس وقت زراعت میں ڈیری شعبہ کا حصہ 50 فیصد ہے اور مجموعی قومی پیداوار میں اس شعبے کا حصہ 11 فیصد ہے۔ اس حوالے سے مینجنگ ڈائریکٹر اینگرو فوڈز کا کہنا تھا کہ ملک بھر میں غذائی معیار کو ریگولیٹری اتھارٹیوں کے ذریعے محفوظ ڈیری مصنوعات کے نظریہ سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت پر بھی بات چیت کی گئی ہے۔[17]

ایک اور خبر یہ معلومات فراہم کرتی ہے کہ یورپی یونین کے پاکستان میں سفیر جین فرینکوئس نے کراچی میں کام کرنے والے اینگرو فوڈز لمیٹڈ کے تربیت یافتہ فارم منتظمین (سپروائزر) سے ڈیری فارموں کے دورے کے دوران ملاقات کی ہے۔ اینگرو فوڈز فارم کے بہتر انتظامی طریقوں کی تربیت اور ڈیری کسانوں کی آمدنی میں اضافے کے ذریعے پائیدار روزگار کے مواقع پیدا کررہی ہے۔ اینگرو نے کل 1,263 افراد کو تربیت دی ہے جن میں 35 فیصد عورتیں ہیں۔ اس وقت 80 تربیت یافتہ فارم منتظم (سپروائزر) تجارتی ڈیری فارموں پر ملازمت کررہے ہیں۔ اس تربیتی منصوبے کے لیے سرمایہ یورپی یونین فراہم کررہی ہے۔[18] ناصرف یورپی حکومتیں اور ان کی سرمایہ دار کمپنیاں بلکہ امریکی دیوہیکل غذائی کمپنیاں بھی پاکستان کی غذا کی منڈی میں متحرک نظر آرہی ہیں۔ مثلاً ایک خبر کے مطابق:[19]

''بین الاقوامی غذائی و زرعی کمپنی کارگل نے آئندہ تین سے پانچ سالوں میں پاکستان میں 200 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان کارگل کمپنی کے اعلیٰ افسران کی وزیر اعظم عمران خان اور دیگر اعلیٰ سرکاری افسران سے ملاقات کے بعد کیا گیا۔ کمپنی کی حکمت عملی میں پاکستان بھر میں مختلف شعبہ جات میں اپنے کاروبار کو وسعت دینا شامل ہے۔ ان کاروباری شعبہ جات میں زرعی تجارت و ترسیلی نظام، خوردنی تیل، ڈیری مصنوعات، گوشت اور جانوروں کی خوراک کے شعبے شامل ہیں''۔

ان خبروں سے یہ واضح ہے کہ غیر ملکی غذا اور دودھ کی کمپنیاں ہمارے دودھ کی پیداوار سے وابستہ چھوٹے کسانوں کے روزگار پر ڈاکہ ڈالنے میں مصروف ہیں۔ اس مضمون کا مقصد کسانوں اور کسان دوست شعبہ جات کو ہوشیار کرنا ہے کہ ''خالص غذا'' کے پیچھے دراصل کیا ارادے ہیں اور ان سے نبٹنے کے لیے عوام کیا اقدامات کرسکتی ہے۔

حوالہ جات

1. DAWN. "PFA disposes of 40,000 litre adulterated milk." January 15, 2018. Accessed from https://www.dawn.com/news/1382968
2. Business Recorder. "53,616 litres of adulterated milk destroyed in Punjab." September 6, 2018. Accessed from https://fp.brecorder.com/2018/09/20180906405061/
3. The News. "PFA discards 5,000 litre impure milk." May 26, 2019. Accessed from https://www.thenews.com.pk/print/476607-pfa-discards-5-000-litre-impure-milk
4. The News. "Punjab to ban sale of unpackaged milk from 2020." October 24, 2019. Accessed from https://www.thenews.com.pk/print/545268-punjab-to-ban-sale-of-unpackaged-milk-from-2020

بقیہ حوالہ جات صفحہ 27 پر دیکھیں

بات تو سچ ہے مگر...

پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں کو ٹیکس ادا کرنے کا حکم

چیف جسٹس سپریم کورٹ میاں ثاقب نثار نے زیر زمین پانی کا اخراج اور اس کی فروخت پر ازخود نوٹس لیتے ہوئے تمام پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں کو فی لیٹر ایک روپے ٹیکس ادا کرنے کا حکم دیا ہے اور کہا ہے کہ یہ رقم دیامر، بھاشا اور مہمند ڈیم فنڈ میں جمع ہوگی۔ عدالتی فیصلے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہ رقم ڈیموں کی تعمیر اور پانی کے حوالے سے کی جانے والی سرگرمیوں میں ہی استعمال ہوگی اور ڈیموں کی تعمیر کے بعد یہ رقم صوبائی حکومتیں اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ عدالت نے وفاق اور صوبائی حکومتوں کو 30 دنوں میں جدید میٹر نصب کرنے اور پانی کے کاروبار سے منسلک تمام کمپنیاں جس مقام سے زیر زمین پانی نکالتی ہیں وہاں کیمرے نصب کرنے کا حکم دیا ہے۔ عدالت نے تمام کمپنیوں کو سالانہ 10,000 درخت لگانے کا بھی حکم دیا ہے۔ کمپنیوں سے کہا گیا ہے کہ وہ یقینی بنائیں کہ بوتلیں بنانے کے لیے جو پلاسٹک استعمال ہورہا ہے اسے قابل اعتماد لیبارٹریوں کی جانب سے تصدیق شدہ اور انسانی استعمال کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہو۔ فوڈ اتھارٹیاں کسی بھی وقت جانچ کے لیے ان کمپنیوں کا اچانک دورہ کرسکتی ہے۔ جن کمپنیوں پر یہ ٹیکس عائد کیا گیا ہے ان میں توانائی شعبہ کی صنعتیں، گودا اور کاغذ، سیمنٹ، چینی، ایتھنول، کپڑا، پٹرولیم ریفائنریاں، پیٹروکیمیکل اور کھاد کی صنعتیں شامل ہیں۔ (ڈان، 12 جنوری، صفحہ 3)

فوج کی زمینوں سے تجارتی سرگرمیاں ختم کرنے کا حکم

سپریم کورٹ کے جسٹس گلزار احمد نے فوج کے اختیار میں زمینوں پر کی جانے والی تمام تجارتی سرگرمیوں کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے حکم پر عمل درآمد کے حوالے سے اجلاس کی صدارت کے دوران جسٹس گلزار احمد نے راشد منہاس روڈ، کراچی پر ہوٹلوں کے آگے گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے بنائی گئی مخصوص جگہیں ختم کرنے اور سڑک پر سے میز کرسیاں بھی ہٹانے کا حکم دیا ہے۔ اجلاس میں سیکریٹری محکمہ بلدیہ، کراچی پولیس چیف، میونسپل کمشنر، ادارہ ترقیات کراچی (KDA)، پی آئی اے (PIA)، سول ایوی ایشن اتھارٹی (CAA)، کنٹونمنٹ بورڈ اور دیگر اداروں کے عہدیداروں نے شرکت کی۔ جسٹس گلزار احمد نے مزید کہا کہ کوئی کتنا بھی بااثر کیوں نہ ہو غیر قانونی تعمیرات کی قطعی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ایک اہم ترین فیصلہ کے تحت جسٹس احمد نے کراچی ماسٹر پلان محکمے کو سندھ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی سے علیحدہ کرنے کا کہا اور اس کو صوبائی حکومت کے اختیار میں منتقل کردیا۔ پچھلے مہینے عدالت نے کراچی کے تمام کنٹونمنٹ بورڈز کو ہدایت کی تھی کہ وہ یقینی بنائیں کہ فوج کے اختیار میں زمینوں پر کسی قسم کی تجارتی سرگرمیاں نہ ہوں، شادی ہال تعمیر نہ ہوں، فوجی زمین صرف اسی مقصد کے لیے استعمال ہو جس کے لیے مختص کی گئی ہے۔ سپریم کورٹ نے ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کی جانب سے کھلی جگہیں الاٹ کرنے کے عمل کو بھی خلاف قانون قرار دیا تھا۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 13 جنوری، صفحہ 4)

کارگل پاکستان میں سرمایہ کاری کرنے کی خواہاں

''بین الاقوامی غذائی و زرعی کمپنی کارگل نے آئندہ تین سے پانچ سالوں میں پاکستان میں 200 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان کارگل کمپنی کے اعلیٰ افسران کی وزیر اعظم عمران خان اور دیگر اعلیٰ سرکاری افسران سے ملاقات کے بعد کیا گیا۔ کمپنی کی حکمت عملی میں پاکستان بھر میں مختلف شعبہ جات میں اپنے کاروبار کو وسعت دینا شامل ہے۔ ان کاروباری شعبہ جات میں زرعی تجارت و ترسیلی نظام، خوردنی تیل، ڈیری مصنوعات، گوشت اور جانوروں کی خوراک کے شعبے شامل ہیں''۔ اس کے علاوہ حفاظت (سیفٹی) اور پیداوار سے لے کر منڈی تک کے تمام مراحل میں خوراک کی نشاندہی کے عمل (فوڈ ٹریسیبلٹی) کو یقینی بنانا شامل ہے۔ کارگل پاکستان کے ڈیری شعبہ کی ترقی میں معاونت کے لیے عالمی معیار کی جدت متعارف کروائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپنی خوردنی تیل کی بڑھتی ہوئی طلب اور مرغبانی صنعت کی ترقی کی وجہ سے جانوروں کی خوراک کی پھیلتی ہوئی منڈی کے لیے بھی مدد فراہم کرے گی۔ کارگل نے پاکستان میں 1948 میں کام شروع کیا تھا اور آج صاف تیل، جانوروں کی خوراک، اجناس و خوردنی تیل، کپاس، چینی اور دھات کے کاروبار سے جڑی ہے۔ کارگل پاکستان میں سویابین، پام آئل اور کوکا پاؤڈر ترسیل کرنے والے بڑے ترسیل کاروں میں

سے ایک ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 18 جنوری، صفحہ 1)

حکومت کا پانچ لاکھ ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ

ایک خبر کے مطابق پچھلے دو سالوں میں اضافی گندم کی پیداوار کے بعد پاکستان نے مارچ، اپریل، 2019 میں نئی فصل کی آمد سے پہلے 500,000 ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت کو گندم کی برآمد سے 16.4 بلین روپے آمدنی کی توقع ہے۔ گندم 32,759 روپے فی ٹن قیمت پر فروخت کیا جائے گا۔ پاکستان ایگری کلچرل اسٹوریج اینڈ سروسس کارپوریشن (PASSCO) کے جاری کردہ اعلامیہ کے مطابق کابینہ کی اقتصادی رابطہ کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ PASSCO (پاسکو) پہلے سے موصول شدہ قیمت 32,759 روپے فی ٹن پر 400,000 ٹن گندم بحری راستے سے اور 100,000 ٹن گندم زمینی راستے سے برآمد کرے گی۔ جنوری میں پاسکو کو 100,000 ٹن گندم کی برآمد کے لیے کیے گئے نیلام عام میں 32,759 روپے فی ٹن کی بولی موصول ہوئی تھی۔ اب پاسکو مزید 500,000 ٹن گندم اسی قیمت پر فروخت کرنا چاہتی ہے۔ ادارہ شماریات پاکستان کے مطابق پاکستان نے موجودہ پیشکش 234 ڈالر (32,759 روپے) فی ٹن کے مقابلے میں گزشتہ چھ ماہ (جولائی تا دسمبر، 2018) میں اوسطاً 210.5 ڈالر فی ٹن کے حساب سے گندم برآمد کی تھی۔ ایگری فورم پاکستان کے چیئرمین ڈاکٹر ابراہیم مغل کے مطابق ملک میں اندازاً 4.5 ملین ٹن ضرورت سے زائد گندم موجود ہے۔ پچھلے سال 18-2017 میں 25.5 ملین ٹن گندم کی پیداوار ہوئی تھی جبکہ ملک کی طلب 24.4 ملین ٹن ہے۔ اس سال بھی گندم کی پیداوار 25.5 ملین ٹن متوقع ہے جو مجموعی کھپت سے ایک ملین ٹن زیادہ ہے۔ پاکستانی گندم کے اہم خریدار افغانستان، متحدہ عرب امارات، انڈونیشیا، اومان اور سری لنکا ہیں۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 15 فروری، صفحہ 13)

اینگرو کے منافع میں 45 فیصد اضافہ

ایک خبر کے مطابق اینگرو کارپوریشن نے 31 دسمبر، 2018 کو ختم ہونے والے سال میں 23.6 بلین روپے منافع کا اعلان کیا ہے۔ کمپنی کا حاصل کردہ منافع گزشتہ سال کے منافع 16.3 بلین روپے کے مقابلے 45.1 فیصد زیادہ ہے۔ کمپنی کے مطابق سال 2018 میں کمپنی نے فی حصص 24.26 روپے منافع حاصل کیا جبکہ 2017 میں فی حصص 17.96 روپے منافع حاصل ہوا تھا۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 21 فروری، صفحہ 20)

جینیاتی مکئی ۔ نامنظور

ایک مضمون کے مطابق ایوان وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ عالمی زرعی اور غذائی کمپنی ''کارگل'' پاکستان میں اگلے دو سے پانچ سالوں میں 200 ملین ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گی۔ یہ اعلان وزیر اعظم عمران خان کی کمپنی کے دو اعلیٰ افسران سے ملاقات کے بعد کیا گیا۔ کم از کم ان لوگوں کو جو دیو ہیکل بائیوٹیکنالوجی کمپنیوں کے بارے میں بہت تھوڑی معلومات رکھتے ہیں انہیں یہ اعلان بے ضرر نظر آرہا تھا۔ ان کمپنیوں میں سے ایک کمپنی مونسانٹو، جینیاتی تبدیلی کی حامل فصلوں (GMO's) کی بانی ہے جس نے دنیا بھر میں کئی فصلوں اور کسانوں کو خوفناک تباہی سے دوچار کیا۔ اب کم از کم دنیا کے 35 ممالک نے GMO's (جی ایم اوز) پر پابندی عائد کردی ہے۔ یقیناً ہمارے سیاسی رہنما اس طرح کے معاملات سے واقف نہیں ہیں لیکن خوش قسمتی سے وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق میں ایسے صاحب علم موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس (جینیاتی ٹیکنالوجی) پر مزاحمت کی ہے۔ اب امریکن بزنس کونسل آف پاکستان جو 64 کمپنیوں کی نمائندگی کرتی ہے، وزیر اعظم سے جینیاتی مکئی کی کاشت کی مدد حاصل کرنے کی کوشش میں ہے تاکہ وہ ''جینیاتی مکئی کو کاروباری سطح پر کاشت کرسکے''۔ یہ امریکی کمپنیاں چاہتی ہیں کہ ان کے (جینیاتی فصلوں کے فروغ کے) تنازع منصوبوں میں حائل رکاوٹیں ختم ہو جائیں۔ اچھی خبر یہ ہے کہ پاکستان کسان مزدور تحریک (PKMT) نے اس سلسلے میں ایک پریس ریلیز ''جینیاتی مکئی نامنظور'' کے عنوان سے جاری کی ہے۔ PKMT (پی کے ایم ٹی) نے پاکستان میں جینیاتی مکئی کی کاشت کو رد کرنے کے وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق کے موقف کی واضح حمایت کی ہے۔ بیج کمپنیوں اور جی ایم اوز پر پی کے ایم ٹی کا اپنا موقف گزشتہ ایک دہائی سے واضح ہے کہ یہ کمپنیاں کسانوں کے بیج کے اجتماعی حق کی خلاف ورزی کرتی ہیں اور چھوٹے و بے زمین کسانوں کو کنگال کردیں گی۔ سیڈ ایسوسی ایشن آف پاکستان نے بھی ملک میں جینیاتی مکئی کی کاشت کی شدید مخالفت کی ہے۔ (زبیدہ مصطفیٰ، ڈان، 1 مارچ، صفحہ 9)

پنجاب فوڈ اتھارٹی کا کھلے دودھ کے خلاف کارروائی

ایک خبر کے مطابق پنجاب فوڈ اتھارٹی (PFA) کی ڈیری حفاظتی ٹیم نے

ملاوٹ شدہ دودھ کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے 6,391 لیٹر دودھ ضائع کردیا ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 30 مارچ، صفحہ 11)

زرعی شعبہ کے لیے 290 بلین روپے لاگت کے منصوبے

سیکریٹری وزارت قومی غذائی تحفظ وتحقیق ہاشم پوپلزئی نے کہا ہے کہ حکومت پانچ سالوں میں 290 بلین روپے کی لاگت سے زراعت کے پانچ اہم شعبہ جات پانی، فصلیں، منڈی، ماہی گیری اور مال مویشی میں مختلف منصوبے شروع کرنے کی منصوبہ بندی کررہی ہے۔ ان منصوبوں کے تحت گنا، چاول اور گندم کی پیداوار میں اضافے اور روغنی بیجوں کی پیداوار کو فروغ دینے کے منصوبے جولائی میں شروع کیے جائیں گے۔ (ڈان، 3 اپریل، صفحہ 10)

تمباکو کمپنی سے ڈیم فنڈ کے لیے رقم کی وصولی

ایک خبر کے مطابق انسانی صحت کے حوالے سے سرگرم کارکنان اس وقت حیرت زدہ رہ گئے جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وزیر اعظم عمران خان نے نا صرف ایک بین الاقوامی تمباکو کمپنی برٹش امریکن ٹوبیکو کے نمائندے سے ملاقات کی بلکہ ملک میں ڈیم کی تعمیر کے لیے کمپنی سے پانچ ملین روپے کا چندہ بھی وصول کیا۔ غیر سرکاری تنظیم ٹوبیکو فری کڈز کے نمائندے ملک عمران کے مطابق یہ عمل عالمی ادارہ صحت (World Health Organization/WHO) کے فریم ورک کنونشن آن ٹوبیکو کنٹرول (FCTC) کی دفعہ 5.3 کی کھلی خلاف ورزی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حکومتی نمائندے تمباکو کمپنیوں سے ملاقات اور ان سے امداد وصول نہیں کرسکتے۔ یہاں تک کہ کمپنی کی سماجی ذمہ داریوں (کارپوریٹ سوشل رسپونسبلیٹی) کے تحت بھی ایسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ بھی تشہیر کا ایک طریقہ ہے۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ یہ عجیب بات ہے کہ یہ رقم وفاقی بجٹ کے اعلان سے ایک ماہ پہلے دی گئی ہے۔ ایک اور غیر سرکاری تنظیم کولیشن فار ٹوبیکو کنٹرول کے پاکستان میں رابطہ کار خرم ہاشمی نے حیرت کا اظہار کیا کہ خود عمران خان طویل عرصے سے انسداد تمباکو کی وکالت کرتے رہے اور کینسر ہسپتال چلارہے ہیں، انہوں نے ایک تمباکو کمپنی سے چندہ وصول کیا جو خود سرطان ہونے کی ذمہ دار ہے۔ حکومت پاکستان نے FCTC (ایف سی ٹی سی) پر مئی، 2004 میں دستخط کیے تھے اور اسی سال اس کی توثیق بھی کی تھی۔ (ڈان، 1 مئی، صفحہ 3)

گندم خریداری: حکومتی فیصلے پر کسان تنظیموں کا سخت ردعمل

ایوان زراعت سندھ کے جنرل سیکریٹری زاہد بھرگڑی نے اپنے جاری کردہ ایک بیان میں کہا ہے کہ سندھ حکومت کے کسانوں سے گندم نہ خریدنے کے فیصلے سے کسانوں کو مجموعی طور پر 28 بلین روپے کے نقصان کا سامنا ہے۔ گودام خالی ہونے کے باوجود حکومت سندھ کا یہ فیصلہ باعث تشویش ہے۔ بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ اس طرح کا فیصلہ کسان دشمن ہے جسے واپس لیا جانا چاہیے اور حکومت کو کسانوں سے گندم کی خریداری کا آغاز کرنا چاہیے۔ اگر سندھ حکومت نے فیصلہ واپس نہ لیا تو کسان احتجاج کریں گے۔ انہوں نے مزید کہا کہ دیگر صوبائی حکومتیں کسانوں سے گندم خریدرہی ہیں اور پاکستان ایگریکلچرل اسٹوریج اینڈ سروسز کارپوریشن (پاسکو) بھی کسانوں سے گندم خرید رہی ہے تو صرف سندھ میں ہی کسانوں سے گندم نہ خریدنے کا فیصلہ کیوں کیا گیا ہے؟ اگر سندھ حکومت نے کسانوں سے گندم نہیں خریدا تو خدشہ ہے کہ اگلے سال صوبے میں گندم کی کاشت میں کمی ہوسکتی ہے جس سے غذائی بحران پیدا ہوسکتا ہے۔ (ڈان، 9 مئی، صفحہ 17)

آٹے میں مصنوعی غذائیت شامل کرنے کے منصوبے کا اجراء

نیشنل فورٹیفیکیشن الائنس پاکستان نے عالمی غذائی پروگرام (World Food Programme/WFP) اور آسٹریلیا کی حکومت کے تعاون سے اسلام آباد اور راولپنڈی میں غذائی کمی سے نمٹنے کے لیے آٹے میں مصنوعی غذائیت شامل کرنے (فورٹیفیکیشن) کے منصوبے کا آغاز کیا ہے۔ WFP (ڈبلیو ایف پی) کے پاکستان میں نمائندے فنبار کوران کے مطابق پاکستان کی تقریباً آدھی آبادی ضروری غذائیت (مائیکرو نیوٹرینٹ) کی کمی کا شکار ہے جو بچوں میں نشو ونما میں کمی، خون کی کمی اور دیگر طبی مسائل کی وجہ ہوسکتی ہے۔ غذائیت کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے ملک میں پہلے ہی بڑے آٹا ملوں میں فورٹیفیکیشن کا عمل شروع ہوچکا ہے۔ اگلے پانچ سالوں میں توقع ہے کہ تمام بڑی آٹا ملوں کی پیداوار لازمی غذائی اجزاء سے بھرپور یعنی فورٹیفائیڈ ہوگی۔ تاہم یہ ہدف اس وقت تک مکمل طور پر پورا نہیں کیا جاسکتا جب تک (چھوٹی) آٹا چکیوں کی پیداوار میں بھی مصنوعی غذائیت شامل نہ ہو کیونکہ یہ چکیاں 70 فیصد آبادی کے لیے آٹا تیار کرتی ہیں۔ (ڈان، 4 مئی، صفحہ 4)

جینیاتی مکئی: پاکستان کے لیے امریکی امداد

امریکی محکمہ زراعت کی فارن ایگریکلچرل سروسز نے کہا ہے کہ مستقبل میں امریکہ و پاکستان کے درمیان مشترکہ منصوبوں میں مرغبانی، ماہی گیری اور مال مویشی شعبے میں خوراک کے طور پر امریکی سویابین کا استعمال، جینیاتی مکئی رائج کرنا اور محفوظ خوراک کے یکساں معیارات مقرر کرنے کے لیے مختلف سرکاری محکموں کے ساتھ کام کرنا شامل ہے۔ امریکی محکمہ زراعت کے اسلام آباد میں نمائندے کیسی ای بین کے مطابق امریکی سویابین مرغبانی، ماہی گیری اور ڈیری صنعت میں بطور خام مال استعمال ہوگا۔ پاکستان میں جینیاتی مکئی کی منظوری زیر غور ہے جو کسانوں کی پیداوار میں اضافے اور زرعی کیمیائی مواد کے استعمال میں کمی کے لیے معاون ہوگی۔ امریکی محکمہ زراعت وزارت قومی غذائی تحفظ و تحقیق کے قومی غذائی نظام منصوبے (نیشنل فوڈ سسٹم پروجیکٹ) کے لیے مدد کرے گا کیونکہ (اٹھارویں ترمیم کے تحت) اختیارات کی صوبوں کو منتقلی کے بعد پاکستان کے لیے ضروری ہوگیا ہے کہ ملک میں خوراک کے تحفظ کی مرکزی اتھارٹی (سینٹرل فوڈ سیکیورٹی اتھارٹی) ہو۔ (ڈان، 20 مئی، صفحہ 5)

کھلے دودھ کے استعمال پر پابندی

پنجاب فوڈ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل محمد عثمان کے مطابق پنجاب میں کھلے دودھ کے فروخت پر 2022 کے بعد مکمل پابندی ہوگی۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 19 جون، صفحہ 11)

عالمی بینک کی زراعت کے لیے 171 ملین ڈالر کی منظوری

عالمی بینک نے خیبرپختونخوا میں آبپاشی نظام میں بہتری اور چھوٹے کسانوں کی مہارت میں اضافہ کرکے ان کی پیداوار کی قدر میں اضافے کے ذریعے زرعی پیداوار میں مدد فراہم کرنے کے لیے 171 ملین ڈالر کی منظوری دے دی ہے۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 22 جون، صفحہ 13)

پاکستان سے غذائی کمی کا خاتمہ!

برطانیہ کا امداد فراہم کرنے والا ادارہ محکمہ بین الاقوامی ترقی کی پاکستان میں سربراہ جوآنا ریڈ کے مقامی اخبار میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق دنیا میں تقریباً دو بلین افراد مختلف نوعیت کی غذائی کمی کے شکار ہیں۔ برطانیہ کا پاکستان میں خوراک میں مصنوعی غذائیت شامل کرنے کا منصوبہ فوڈ فورٹی فیکیشن پروگرام 70 فیصد آبادی کو اضافی غذائیت کا حامل خوردنی تیل فراہم کرے گا اور 50 ملین سے زیادہ افراد کی مصنوعی غذائیت کے حامل آٹے تک رسائی فراہم کرے گا۔ اب ہم جانتے ہیں کہ قومی غذائی سروے 2018 کے مطابق کہاں کھڑے ہیں اور اب وفاق و صوبائی حکومتوں کو اس سلسلے میں مستقبل کے لیے ترجیحی منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 14 جون، صفحہ 16)

لیز پالیسی: 120,700 ایکڑ زمین کسانوں میں تقسیم

پنجاب کے وزیر اطلاعات و ثقافت میاں اسلم اقبال کے مطابق پنجاب کابینہ نے ایک تاریخی فیصلہ کیا ہے جس کے مطابق پنجاب کے 30 اضلاع میں لیز پالیسی کے تحت کسانوں میں ایک لاکھ بیس ہزار سات سو (120,700) ایکڑ زمین تقسیم کی جائے گی۔ طویل عرصے کے بعد غیر آباد زمینیں کسانوں کو کاشتکاری کے لیے دی گئی ہیں اور کسانوں نے اپنی سخت محنت کے بعد ان زمینوں کو آباد کیا ہے اور اب یہ زمینیں انہیں فراہم کی جائیں گی۔ اس حوالے سے طریقہ کار تیار کیا گیا ہے اور ہر ضلع کا کلکٹر زمین کی قیمت کا تعین کرے گا۔ فیصلے کے مطابق کسانوں کو 12.5 ایکڑ کے حساب سے زمین فراہم کی جائے گی اور اس حوالے سے پالیسی میں تفصیلی اصول اور طریقہ کار واضح کیا گیا ہے۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 24 جولائی، صفحہ 2)

کسانوں کی جانب سے ملک بھر میں احتجاج کا عندیہ

حکومت کی جانب سے کسانوں کے مطالبات پورے نہ کرنے کے بعد کسان کمیونٹی نے ملک بھر میں احتجاج کرنے کا اشارہ دیا ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان کسان اتحاد (PKI) جو کہ کسانوں کی ایک تنظیم ہے نے آئندہ کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ہنگامی اجلاس طلب کیا ہے۔ PKI (پی کے آئی) کے صدر خالد کھوکھر کے ''مطابق حکومت نے 2019-20 کے بجٹ میں نہ صرف ہمارے مطالبات پر کان نہ دھرے بلکہ کھاد پر ویلیو ایڈڈ ٹیکس (VAT) اور کاٹن جینرز پر 10 فیصد جنرل سیلز ٹیکس عائد کیا ہے''۔ ان کا کہنا تھا کہ حکومت نے زرعی مشینری اور کھاد پر عائد دو فیصد جنرل سیلز ٹیکس ختم کرنے کی یقین دہانی کرائی تھی اور ہم نے قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے زراعت جس کی صدارت اسپیکر قومی اسمبلی اسد قیصر کرتے ہیں انہیں زراعت کے لیے بجلی

کے نرخ 6.85 فی یونٹ سے کم کرکے چار روپے فی یونٹ کرنے کی گزارش کی تھی۔ کھوکھر کے مطابق ملک میں یوریا اور ڈی اے پی کی قیمت ہمسایہ بھارت کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 1 جولائی،صفحہ13)

ملک کے 50 فیصد خاندانوں کو دو وقت کی غذا میسر نہیں

ایک خبر کے مطابق نیشنل نیوٹریشن سروے (NNS) 2018 میں انکشاف کیا گیا ہے کہ پاکستان کے تقریباً آدھے گھرانے اپنی غذائی ضروریات پوری کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ غربت کی وجہ سے تقریباً 50 فیصد سے زائد خاندانوں کو یومیہ دو وقت کا کھانا دستیاب نہیں ہے جو سنگین غذائی کمی کا باعث بن رہا ہے جس کے نتیجے میں 40.2 فیصد بچے دائمی غذائی کمی اور نشو و نما میں کمی کا شکار ہیں۔ غذائی کمی کی وجہ سے ان بچوں کی ذہنی و جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے۔ سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ 36.9 فیصد پاکستانی گھرانے غذائی عدم تحفظ کا شکار ہیں جنہیں مناسب مقدار اور قیمت میں غذائیت بخش خوراک تک رسائی حاصل نہیں۔ سیکرٹری جنرل پاکستان پیڈیاٹرک ایسوسی ایشن خالد شفیع کا کہنا ہے کہ غذائیت کے حوالے سے ہنگامی صورتحال پر قابو پانے کے لیے وفاقی حکومت خوراک میں مصنوعی طور پر اضافی غذائیت شامل کرنے (فوڈ فورٹیفیکیشن) کے لیے قانونی مسودہ تیار کرچکی ہے جس سے گھی و آٹے جیسی اشیاء میں خرد غذائی اجزاء (مائیکرو نیوٹرنٹ) شامل کرنا لازمی ہوجائے گا۔

یہ سروے پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا سروے ہے جس میں چاروں صوبوں بشمول گلگت بلتستان اور آزاد کشمیر کے شہری اور دیہی آبادیوں کی جانچ کی گئی ہے۔ سروے میں 115,600 خاندانوں جن میں 145,324 عورتیں، پانچ سال سے کم عمر کے 76,742 بچے اور 10 سے 19 سال کے 145,847 بچوں سے پوچھ گچھ کی گئی۔ سروے کے حقائق کے مطابق صرف 48.4 فیصد مائیں اپنے نوزائیدہ بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ جبکہ ماؤں میں ضروری غذائی اجناس کی کمی ہے جس سے کمزور بچے پیدا ہورہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر دس میں سے چوتھے بچے میں عمر کے حساب سے بڑھوتری نہیں ہوتی جس کی بنیادی وجہ تعلیم اور شعور کا نہ ہونا ہے۔ سروے میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ملک میں کئی خاندانوں میں لڑکا اور لڑکی کے غذا میں فرق کیا جاتا ہے۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف چائلڈ ہیلتھ کے چیئرمین پروفیسر جمال رضا کے مطابق پاکستان میں غذائیت میں کمی آج بھی وہی ہے جو 24 سال پہلے تھی۔ (دی ایکسپریس ٹریبون، 24 جولائی،صفحہ2)

محکمہ ریونیو: جنگلات کی زمین کی غیر قانونی فراہمی

سندھ اسمبلی کو بتایا گیا کہ صوبائی محکمہ ریونیو نے غیر قانونی طور پر 78,444 ایکڑ زمین مختلف شخصیات اور اداروں کو فراہم کی ہیں۔ اسمبلی میں سوالات کیے جانے والی نشست میں سندھ کے وزیر جنگلات و جنگلی حیات سید ناصر حسین شاہ کا کہنا تھا کہ محکمہ ریونیو نے 80 فیصد زمین غیر قانونی طور پر ان وقتوں میں فراہم کی کہ جب صوبے میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں تھی۔ (ڈان، 2 جولائی،صفحہ16)

2022 تک گندم کے ہائبرڈ بیج کی دستیابی

گارڈ ایگریکلچرل ریسرچ اینڈ سروسیز کے سربراہ شہزاد علی ملک نے کہا ہے کہ پاکستان میں 2020 تک گندم کا ہائبرڈ بیج دستیاب ہوگا اور توقع ہے کہ یہ بیج ملک میں اس وقت کاشت کیے جانے والے روایتی بیجوں کے مقابلے 40 سے 45 فیصد پیداوار میں اضافے کے لیے معاون ہوگا۔ اس حوالے سے بیجنگ اکیڈمی آف ایگریکلچرل سائنس کے تعاون سے کام جاری ہے اور گزشتہ پانچ سالوں کے دوران اس منصوبہ پر 2.5 ملین ڈالر خرچ کیے جاچکے ہیں۔ (دی ایکسپریس ٹریبون، 24 اگست،صفحہ20)

حکومت مویشیوں کے تین منصوبے شروع کرے گی

وزیر اعظم کے مویشیوں کے حوالے سے اقدامات کے تحت ان کی پیداوار میں اضافے کے لیے حکومت نے تین منصوبے شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ذرائع کے مطابق ان منصوبوں میں بچھڑوں کو محفوظ کرنے (سیو دی کالف)، بچھڑوں کو صحت مند بنانے (فیٹنگ آف کالف) اور گھروں میں مرغبانی (بیک یارڈ پولٹری) کرنا شامل ہیں۔ (بزنس ریکارڈر، 8 ستمبر،صفحہ11)

کپاس کی پیداوار میں 26 فیصد کمی

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پچھلے سال کے مقابلے میں اس سال کپاس کی پیداوار 0.664 ملین گانٹھ کم یعنی کپاس کی پیداوار میں 26.41 فیصد کمی کا سامنا ہے۔ ماہر کپاس نسیم عثمان کے مطابق کپاس کی پیداوار میں کمی 2019-20 سیزن کی پہلے مدت یعنی 15 ستمبر تک کا تخمینہ ہے۔ یہ ایک خطرناک مرحلہ ہے جو ملک کی مجموعی پیداوار کو بلواسطہ متاثر کرے گا جبکہ تین

سے چار ملین گانٹھ کپاس درآمد کرنے سے ملک کے غیر ملکی زرمبادلہ پر دباؤ پڑے گا۔ پاکستان کاٹن جینرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین میاں محمود احمد کا کہنا ہے کہ کپاس کے زیادہ پیداواری ہدف کے حصول کے لیے حکومت کی جانب سے کسانوں کو جو مراعات فراہم کرنے کا اعلان کیا تھا وہ کبھی فراہم نہیں کیے گئے۔ بہاولپور سے ایک کسان عبدالستار کے مطابق حکومت کی جانب سے چینی برآمد کرنے والوں کو زرتلافی فراہم کررہی ہے اور اس وجہ سے کپاس کی زیر کاشت علاقے میں اب گنے کی کاشت کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ کسان مکئی کی کاشت کی طرف بھی مائل ہورہے ہیں کیونکہ وہ ایک ہی سال میں تین فصلیں حاصل کرسکتے ہیں۔ پنجاب میں کپاس کی پیداوار میں پچھلے سال کے اس سیزن کے مقابلے میں 0.598 ملین گانٹھ ہوئی ہے جبکہ پچھلے سال 0.980 ملین گانٹھ ہوئی تھی۔ اسی طرح سندھ میں بھی کپاس کی پیداوار کم ہے۔ اس سیزن میں 1.254 ملین گانٹھ ہوئی جبکہ پچھلے سال اس سیزن کے دوران 1.537 ملین گانٹھ ہوئی تھی۔ (ڈان، 19 ستمبر، صفحہ 10)

غربت کے خاتمے کے لیے بل گیٹس فاؤنڈیشن سے معاہدہ

بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نے پاکستان کے ساتھ غربت کے خاتمے کے منصوبے ''احساس'' کے لیے مفاہمت کی ایک یادداشت پر دستخط کیے ہیں۔ بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن نشو ونما میں کمی کے نتیجے میں بچوں میں ہونے والی قد میں کمی (اسٹنٹنگ) کے مرض کو کم کرنے کے منصوبے، مالی شمولیاتی (فنانشل انکلوژن) اقدامات میں مدد، نومولود، عورتوں اور بچوں میں اموات میں کمی کے لیے عوامی طبی سہولیات کے نظام میں سرمایہ کاری سمیت مختلف سرگرمیوں میں حکومت پاکستان کی مدد کرے گی۔ فاؤنڈیشن نے 2020 میں پاکستان میں 200 ملین ڈالر خرچ کرنے کی منصوبہ بندی کی ہے۔ اس موقع پر وزیر اعظم عمران خان اور بل گیٹس خود موجود تھے۔ دونوں کے درمیان احساس پروگرام کے حوالے سے تفصیلی بات چیت ہوئی۔ (ڈان، 27 ستمبر، صفحہ 5)

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی کی جینیاتی مکئی کی کاشت پر بحث

قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قومی غذائی تحفظ وتحقیق کو جینیاتی فصلوں کے فروغ کے لیے کام کرنے والی لابی ملک میں جینیاتی مکئی کے فوائد اجاگر کرکے اس کی کاشت کی منظوری لینے کی کوشش کررہی ہے جس کی کاشت پر پاکستان میں پابندی ہے۔ اس سلسلے میں کمیٹی کے آنے والے اجلاس کے ایجنڈے میں پاکستان میں جینیاتی بیج کے تعارف پر بحث شامل ہونے کے ساتھ بی ٹی کپاس اور مکئی پر کراپ لائف آف پاکستان کی جانب سے جائزہ بھی شامل ہے۔ کراپ لائف پاکستان بین الاقوامی بیج کمپنیوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم ہے۔ دوسری طرف کمیٹی کے کئی اراکین ملک میں جینیاتی مکئی متعارف کرانے کے حوالے سے پہلے ہی اپنے تحفظات کا اظہار کرچکے ہیں۔

موجودہ حکومت نے پچھلے سال اس معاملے پر تحویل بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ ملک میں جینیاتی مکئی کی کاشت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وفاقی حکومت کی جانب سے فراہم کی گئی پالیسی جس میں جینیاتی مکئی کی کاشت پر پابندی ہے کی روشنی میں مکئی کاشت کرنے والے دو بڑے صوبے پنجاب اور خیبرپختونخوا کو خطوط کے ذریعے اس پابندی سے مطلع کیا گیا ہے۔ غذائی فصلوں میں جینیاتی ٹیکنالوجی استعمال نہ کرنے کی واضح پالیسی موجود ہونے کے باجود جینیاتی مکئی کے نام نہاد فوائد پر کمیٹی میں ہونے والی بات چیت پر ارکان نے حیرانگی کا اظہار کیا ہے۔ ساہیوال جو کہ مکئی کے کاشت کا اہم علاقہ ہے کے ممبر قومی اسمبلی چودھری محمد اشرف کا کہنا ہے کہ ان کو یہ سمجھ نہیں آیا کے بار بار جینیاتی مکئی کی بحث کمیٹی میں کیوں کی جاتی ہے۔ اسی طرح کمیٹی کے دوسرے ارکان نے بھی جینیاتی مکئی کی سخت مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ پاکستان میں مکئی کی جینیاتی بیجوں کی درآمد کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ پاکستان میں کاشت کے لیے موزوں نہیں ہے۔ (دی اٹریبیون، 17 اکتوبر، صفحہ 20)

چھوٹے کسانوں کے لیے اسمارٹ زرتلافی کی تجویز

اینگرو کمپنی کے چیف فنانشل آفیسر عمران احمد کا کہنا ہے کہ اسمارٹ زرتلافی یعنی موثر طریقوں سے زرتلافی کی فراہمی جیسے اقدامات سے نہ صرف چھوٹے کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا بلکہ اس سے پاکستان کا زرعی شعبہ بھی ترقی کرے گا۔ اس طرح کے اقدام سے لاکھوں پاکستانیوں کے روزگار میں بہتری آئے گی جبکہ غذائی تحفظ بھی یقینی ہوگی۔ پاکستان میں 50 فیصد زمین صرف 10 فیصد امیر زمینداروں کے پاس ہے جبکہ باقی 90 فیصد کے پاس بہت کم زمین ہے اور یہ اعداد وشمار چھوٹے کسانوں کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس صورتحال میں حکومت کی طرف سے یوریا کی پیداوار پر درآمدی قدرتی گیس (ایل این جی) کے ذریعے دی جانے والی زرتلافی براہ راست بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کو فائدہ پہنچا رہی ہے جو زرعی آمدنی پر کوئی ٹیکس

ادا نہیں کرتے ہیں۔ (دی ایکسپریس ٹریبیون، 24 اکتوبر، صفحہ 20)

ٹماٹر خریدنا ایک خواب

تاجروں نے کراچی کی منڈی میں ایرانی ٹماٹر کی آمد سے پہلے ہی قیمت کو 240-250 سے بڑھا کر 300-320 روپے فی کلو کردیا ہے۔ صارفین 300 روپے کلو ٹماٹر خریدنے پر مجبور ہیں اور اب ٹماٹر خریدنا ان کے بس سے باہر ہورہا ہے۔ دوسری طرف خوردہ فروشوں نے بھی پیاز کی قیمت 80 روپے سے بڑھاکر 90-100 روپے فی کلو کردی جبکہ سندھ کے دیگر پیاز اگانے والے علاقوں سے پیاز کی پیداوار کے علاوہ سوات اور افغانستان سے بھی پیاز منڈی میں آچکا ہے۔ مقامی منڈی میں قیمت میں اضافے کے باوجود پیاز کو سری لنکا، مشرقی بعید اور بنگلہ دیش 550 ڈالر ٹن کے حساب سے برآمد کیا جارہا ہے۔ شہر کی بڑی منڈی کے تاجروں کا ٹماٹر کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے کہنا ہے کہ ٹماٹر کی ہول سیل قیمت 240 روپے سے کم ہوکر 200 روپے تک آگئی ہے لیکن خوردہ فروشوں کا صارفین سے زیادہ قیمت لینا باعث حیرت ہے۔ دوسری طرف حکومت نے ایران سے 4,500 ٹن ٹماٹر درآمد کرنے کی اجازت دی ہے جس کے بعد کہا جارہا ہے کہ ٹماٹر کی فی کلو قیمت 100 روپے ہوجائے گی۔ (ڈان، 17 نومبر، صفحہ 16)

سندھ اسمبلی: زرعی مزدور عورتوں کے لیے قانون کی منظوری

سندھ اسمبلی نے زراعت اور مال مویشی شعبہ میں کام کرنے والی مزدور عورتوں کو حقوق دینے کے لیے سندھ وومن ایگریکلچر ورکرز بل 2019 منظور کرلیا ہے۔ یہ قانون زرعی مزدور عورتوں کی تنخواہ اور ان کی کم سے کم اجرت سے متعلق ہے جو انہیں شناخت دیتا ہے اور ان کے حقوق کے فروغ اور تحفظ کو یقینی بناتا ہے۔ بل کے مطابق زمین پر یا مال مویشی شعبہ میں ایک زرعی مزدور عورت کو کسی بھی کام کے بدلے، بطور ایک خاندان کے فرد کے یا ذاتی حیثیت میں اجرت نقد یا کسی شئے کی صورت میں ادا ہوگی، چاہے زمین اور مال مویشی اس کے، اس کے خاندان کے یا کسی اور کے ہوں۔ ایک جیسے کاموں کے لیے عورت کی اجرت مرد کی اجرت کے برابر ہوگی۔ زرعی مزدور عورت کی اجرت حکومت کی جانب سے مقرر کی گئی کم سے کم اجرت سے کسی بھی صورت کم نہیں ہوگی۔ ان کے لیے کام کے اوقات ایک دن میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوں گے اور کام کا دورانیہ صبح سویرے کے ایک گھنٹے بعد تک شروع نہیں ہوگا، اور یہ (آٹھ گھنٹے پر مشتمل) دورانیہ غروب آفتاب کے ایک گھنٹے پہلے تک جاری رہے گا۔ زرعی مزدور عورتیں بیماری، حمل و زچگی اور معمول کے طبی معائنہ کے لیے کام سے چھٹی لے سکیں گی۔ ایک زرعی مزدور عورت 120 دن کی زچگی کی چھٹی لینے کی حقدار ہوگی اور عدت کی چھٹیاں لینے کی مجاز ہوگی۔ قانون کے مطابق زرعی مزدور عورتیں صاف ستھرے ماحول میں اپنے دو سال تک کے بچوں کو دودھ پلاسکیں گی اور بچے کی ابتدائی چھ ماہ کی عمر تک مزدور عورتوں کو خصوصی طور پر بچے کو دودھ پلانے کے لیے ضروری مدد فراہم کی جائے گی۔ انھیں زراعت، مال مویشی، ماہی گیری اور دیگر شعبہ جات میں سرکاری خدمات، قرضہ جات، سماجی تحفظ، زرتلافی اور اپنے نام پر اثاثوں کی منتقلی کے حقوق حاصل ہوں گے۔ ہر زرعی مزدور عورت ہر قسم کی حراسانی یا بدسلوکی سے آزاد ماحول میں کام کرے گی۔ مزدور عورتوں کی جانب سے تقاضہ کرنے پر انہیں ملازمت کا تحریری معاہدہ فراہم کیا جائے گا۔ یہ قانون ان عورتوں کو تنظیم سازی اور کسی بھی تنظیم کے ساتھ جڑنے کا حق دیتا ہے۔ یہ قانون واضح کرتا ہے کہ ان زرعی مزدور عورتوں کے درمیان ملازمت کے مواقعوں، اجرت، صنفی بنیاد پر کام کے حالات، زمینی ملکیت، ذات، مذہب، زبان اور سکونت کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جائے گی۔ یہ قانون صوبائی محکمہ برائے مزدور و انسانی وسائل کو ہر یونین کونسل میں زرعی مزدور عورتوں کا رجسٹر رکھنے کا پابند کرتا ہے۔ ہر زرعی مزدور عورت جہاں وہ مقیم ہے یونین کونسل میں اندراج کے لیے رجوع کرسکتی ہے۔ اندراج شدہ زرعی مزدور عورتوں کو ''بے نظیر وومن ایگری کلچر ورکر کارڈ'' جاری ہوگا۔ تنظیم کے اندراج کے لیے ضروری ہے کہ تنظیم کم از کم پانچ کارڈ کی حامل زرعی مزدور عورتوں پر مشتمل ہو۔ (ڈان، 20 دسمبر، صفحہ 15)

موسمی تبدیلی: پاکستان میں ہر سال 128,000 افراد ہلاک

ایک خبر کے مطابق پارلیمانی کمیٹی برائے انسانی حقوق کا اجلاس چیئرمین مصطفیٰ نواز کھوکھر کی زیر صدارت ہوا جس میں ارکان یہ جان کر دنگ رہ گئے کہ پاکستان میں ہر سال موسمی تبدیلی سے بلواسطہ یا بلاواسطہ 128,000 افراد ہلاک ہوتے ہیں۔ ایڈیشنل سیکریٹری وزارت موسمی تبدیلی جودت ایاز نے کمیٹی کو کہا کہ ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے پاکستانیوں کی اوسط عمر میں دو سے پانچ سال کی کمی ہوسکتی ہے۔ ملک میں 43 فیصد آلودگی کی وجہ کم معیار کا درآمدی ایندھن ہے جو آمد و رفت اور توانائی کی صنعت میں استعمال ہوتا ہے۔ ان

کے مطابق آلودگی کی وجہ سے بچے بیماریوں سے مزاحمت کی صلاحیت کھو رہے ہیں۔ پاکستان کی ایندھن (تیل) کے حوالے سے آخری پالیسی 1997 میں بنائی گئی تھی۔ اس کے بعد سے کسی نے بھی نئی پالیسی تیار نہیں کی جو جدید ترقی، ٹیکنالوجی اور ضروریات کے مطابق ہو۔ پاکستان میں اب تک ایندھن کا معیار یورو-2 نافذ ہے جبکہ دنیا یورو-6 ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہے۔ موسمی تبدیلی کی وجہ سے ملک کی مجموعی پیداوار (جی ڈی پی) نو فیصد متاثر ہو رہی ہے۔ ملک میں تیل صاف کرنے والے پانچ بڑے کارخانے پرانے اور فرسودہ ہیں جبکہ تیل میں میگنیشیم اور سلفر کی مقدار زیادہ ہے جو کہ انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ (ڈان، 31 دسمبر، صفحہ 4)

رخ زمانہ...

دنیا کے 26 امیر ترین افراد کی دولت!

آکسفیم (Oxfam) کے مطابق دنیا کے 26 امیر ترین افراد کی دولت انسانیت کے نصف حصہ پر مشتمل غریب ترین افراد کی دولت کے برابر ہے۔ آکسفیم نے خبردار کیا ہے کہ بے قابو عدم مساوات عوامی غصے کو بھڑکا رہی ہے اور جمہوری حکومتوں کو خطرے سے دوچار کر رہی ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 22 جنوری، صفحہ 20)

عالمی تجارتی ادارے کا زرتلافی کے حوالے سے فیصلہ

عالمی تجارتی ادارے (World Trade Organization/WTO) نے تین سال قبل امریکہ کی جانب سے چین کے خلاف گندم اور چاول کے کسانوں کو غیر منصفانہ زرتلافی فراہم کرنے کے حوالے سے دائر کردہ مقدمہ میں امریکہ کے حق میں فیصلہ سنا دیا ہے۔ امریکہ نے 2016 میں چین پر الزام عائد کیا تھا کہ چین گندم، چاول اور مکئی کی پیداوار پر WTO (ڈبلیو ٹی او) کی متفقہ حد سے زائد یعنی 100 بلین ڈالر کی زرتلافی فراہم کر رہا ہے۔ اس تنازعہ کے حل کے لیے ڈبلیو ٹی او کے تشکیل کردہ پینل میں یہ بات سامنے آئی کہ چین نے ڈبلیو ٹی او کی مقرر کردہ حد سے زیادہ زرتلافی فراہم کی ہے اور عالمی تجارتی قوانین کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہے۔ امریکہ کے تجارتی نمائندے روبرٹ لائی تھائیزر اور سیکریٹری زراعت سونی پرڈو نے ایک اعلامیہ میں اسے امریکی زراعت کے لیے فتح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ فیصلہ عالمی منڈی میں امریکی کسانوں کو مسابقت میں مدد دے گا۔ (ڈان، 1 مارچ، صفحہ 10)

وینزویلا: 80 فیصد گھرانوں کو خوراک کی قلت کا خطرہ

ایک خبر کے مطابق وینزویلا میں معاشی بحران کی وجہ سے ہر دس گھرانوں میں سے آٹھ گھرانوں کو خوراک کی کمی کا خدشہ ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 1 مارچ، صفحہ 13)

فرانس: مونسانٹو کو ایک اور شکست

فرانس کی ایک عدالت میں دیوہیکل کیمیائی زرعی کمپنی مونسانٹو ایک کسان کی جانب سے دائر کیے گئے ایک مقدمے میں ہار گئی ہے۔ عدالت نے اپنا فیصلہ برقرار رکھتے ہوئے مونسانٹو کو کسان پال فرانکوئس کی جانب سے دائر کیے گئے مقدمے میں قصوروار قرار دیا ہے جو اس کے ایک نباتات کش زہر کے استعمال کی وجہ سے اعصابی بیماریوں (نیورولوجیکل ڈیمیج) کا شکار ہے۔ مذکورہ فیصلہ کمپنی کو اس کے متنازع نباتات کش زہر کے حوالے سے لگنے والا تازہ ترین دھچکہ ہے۔ پال فرانکوئس گزشتہ 12 سالوں سے مونسانٹو کے خلاف یہ مقدمہ لڑ رہے تھے۔ دنیا میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فرانس کی عدالت نے 2012 میں مونسانٹو کو کسان پال فرانکوئس کی بیماری کا ذمہ دار قرار دیا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف مونسانٹو نے درخواست دائر کی جو وہ 2015 میں ہار گئی تھی۔ تاہم کمپنی نے (دوبارہ اپیل کر کے) مزید قانونی جنگ لڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ (بزنس ریکارڈر، 12 اپریل، صفحہ 17)

موسمی تبدیلی: نوجوانوں کی یورپ بھر میں احتجاجی ریلیاں

یورپی یونین پارلیمنٹ کے عنقریب ہونے والے الیکشن کے موقع پر پورے یورپ میں ہزاروں نوجوانوں نے دنیا بھر میں عالمی حدت (گلوبل وارمنگ) کے خلاف اقدامات کے مطالبے کے لیے احتجاجی ریلیاں منعقد کی ہیں۔ (بزنس ریکارڈر، 25 مئی، صفحہ 6)

آئی ایل او کے حراسانی کے خلاف کنونشن کی منظوری!

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن نے حکومتوں، آجروں اور مزدور تنظیموں (لیبر گروپس) کے درمیان مشکل ترین مزاکرات کے بعد کام کی جگہوں پر حراسانی اور تشدد کی روک تھام کے حوالے سے ایک تاریخی کنونشن منظور کیا ہے۔ (بزنس ریکارڈر، 22 جون، صفحہ 11)

تبصرہ

بظاہر یہ نظر آرہا ہے کہ ملک میں اعلیٰ ترین عدلیہ چند مثالی فیصلے کررہی ہیں جس میں مختلف کمپنیوں کو ٹیکس کی ادائیگی کا پابند بنایا گیا اور ساتھ ہی پانی فروخت کرنے والی کمپنیوں کو درخت لگانے کا بھی حکم دیا ہے۔ ان چند اہم فیصلوں میں فوج کے زیر اختیار زمینوں پر تجارتی سرگرمیوں پر پابندی کا حکم بھی شامل ہے۔ مگر دوسری طرف اس بات کو یکسر نظر انداز کردیا گیا کہ پانی کا کاروبار کرنے والی یہ کمپنیاں خصوصاً دیوہیکل بین الاقوامی کمپنیاں کس طرح پانی جیسے قدرتی وسائل کا استحصال کرتے ہوئے خطیر منافع حاصل کررہی ہیں۔ اس بات کا اندازہ نیسلے کی سالانہ آمدنی سے لگایا جاسکتا ہے جو کہ نیسلے پیور لائف نامی بوتل بند پانی تیار کرتی ہے۔ نیسلے کے مطابق 2019 میں سالانہ فروخت تقریباً 122 ارب روپے جبکہ اس دورانیہ میں منافع 7.35 ارب روپیہ رہا تو پھر کیا یہ المیہ نہیں کہ پاکستان کی ایک بڑی آبادی پینے کے صاف پانی جیسی بنیادی سہولت سے محروم ہے اور اس سے جڑے بے پناہ صحت کے مسائل سے دو چار ہے جن کی وجہ سے ہر سال لاکھوں بچے مرجاتے ہیں لیکن پانی کا کاروبار کرنے والی کمپنیاں بیش بہا منافع کے مزے لے رہی ہیں۔ پانی کے ساتھ ساتھ دودھ اور مال مویشی شعبہ پر بھی کمپنیوں کے قبضہ کی بھرپور تیاری ہے۔ حکومت پنجاب 2022 کے بعد کھلے دودھ پر مکمل پابندی کا فیصلہ کیا ہے، جس کے نتیجہ میں اس شعبہ سے وابستہ لاکھوں افراد کی روزگار اور تحفظ خوراک پر کاری ضرب یقینی ہے۔

دیگر خبروں سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ حکومت آزاد تجارتی پالیسیوں پر تیزی سے عمل درآمد کرنے پر تلی ہے اسی لیے کارگل جیسی کمپنیوں کو سرمایہ کاری کے لیے پرکشش ترغیبات دے رہی ہے۔ کارگل کا دعوی ہے کہ وہ پاکستان میں زراعت، خوراک، ڈیری اور دیگر شعبوں میں سرمایہ کاری کرے گی۔ یاد رہے کارگل کمپنی کو ماحولیاتی آلودگی پیدا کرنے والی دنیا کی بدترین کمپنی کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ایک طرف عمران خان کی حکومت عالمی فورم پر پاکستان میں ماحولیاتی آلودگی اور پائیدار ترقی کے لیے بلند بانگ دعویٰ کرتی ہے جس کا ذکر انہوں نے اپنی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے خطاب میں بھی کیا، مگر دوسری طرف کارگل جیسی بدترین کمپنیوں کی پاکستان میں سرمایہ کاری کو خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ حکومت تمباکو اور سیمنٹ بنانے والی کمپنیوں سے جو بدترین ماحولیاتی آلودگی اور صحت کے لیے شدید خطرات اور اموات کی ذمہ دار ہیں، ڈیم فنڈ کے لیے رقوم بھی وصول کررہی ہے۔ یہ اقدامات کھلا تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟

بل اینڈ میلنڈا گیٹس فاؤنڈیشن سے معاہدہ ہو یا چھوٹے کسانوں کے لیے اسمارٹ زرتلافی کی تجویز، عالمی بینک کی زراعت کے لیے امداد ہو یا جینیاتی مکئی کے لیے امریکی امداد ان تمام حکمت عملیوں سے پاکستانی عوام خصوصاً چھوٹے اور بے زمین کسانوں کو فائدہ نہیں ہوگا۔ ان اقدامات سے مقامی منڈی پر سرمایہ کاروں اور کمپنیوں کے قبضے کے ساتھ ساتھ پاکستان میں صنعتی زراعت کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور مقامی آبادیوں کے لیے بے روزگاری اور غربت کے ساتھ ساتھ شدید ماحولیاتی آلودگی کا سامنا بھی۔

سندھ میں سرکاری سطح پر گندم کی خریداری نہ کرنے اور وفاقی حکومت کا پانچ لاکھ ٹن گندم برآمد کرنے کا فیصلہ بھی آزاد تجارتی پالیسی کا ایک تسلسل ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ عوام کے غذائی تحفظ کو منڈی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے یہ سب ایسی عوام کے ساتھ جو کہ شدید غذائی کمی کا پہلے سے شکار ہے۔ اس کے علاوہ غذائی کمی کو پورا کرنے کے لیے نا کہ حکومت صحت مند طریقہ پیداوار کو فروغ دیتی اور کیمیائی کھاد، مصنوعی بیج اور کیڑے مار ادویات کو رد کرتے ہوئے ایگرو ایکالوجی کے تحت پائیدار زراعت کو فروغ دیتی، ایک مہنگا ترین مصنوعی اور فوری حل نکالا جارہا ہے جس کے تحت اب آٹے میں مصنوعی طور پر غذائیت شامل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے جو کمپنیوں کے لیے منافع کی نئی راہیں کھول دے گا۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ملک میں حکومت عدلیہ، فوج سمیت تقریباً تمام بااختیار ادارے منافع بخش کاروبار کو پالیسی سازی اور قانونی تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہر سطح پر متحرک نظر آتے ہیں۔ جبکہ اعداد و شمار ظاہر کررہے ہیں کہ ملک میں 50 فیصد کسان مزدور طبقہ ان ہی منافع خور کمپنیوں اور حکومتی پالیسیوں کی وجہ سے دو وقت کی خوراک سے بھی محروم کردیے گئے ہیں۔